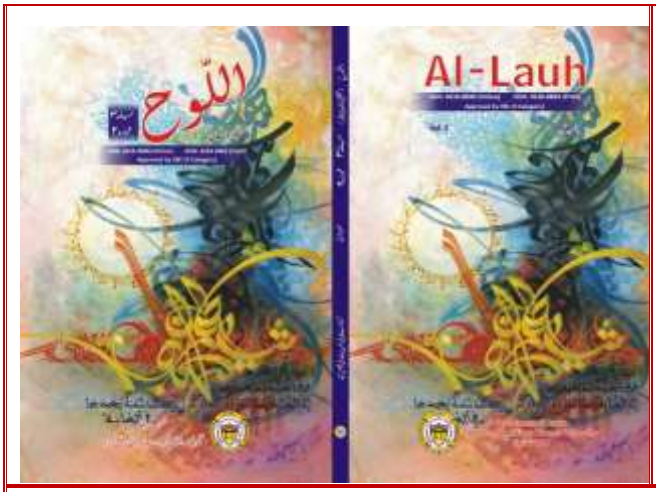

OPEN ACCESS

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

Al-Lauh

Bi-Annual, Trilingual (Arabic, English, Urdu) ISSN: (P) 2618-088X. (E) 2618-0898

Project of **Govt. College Women University Faisalabad,**

Madina Town, Faisalabad, Pakistan.

Website: www.allauh.com

Approved by Higher Education Commission Pakistan

Indexing: Euro Pub, Journal Factor, DOAJ, DRJI, Urdu Jaraid, Asian Research Index

TOPIC

نظام حکومت کی اصلاح اور حضرت مجدّد الف ثانیؒ

Transformation of Political System,In Light of The Ideas Of Hazrat Mujaddid Alf Sani

AUTHOR

1. Hafiz Abdul Ahad Tarar, BS Islamic Studies, Sheikh Zaid Islamic Center, Punjab University, Lahore abdulahadtarar25@gmail.com
2. Prof. Dr. Muhammad Akram Virk, Govt. Graduate College, Sattelite Town, Gujranwala drmakramvirk1968@gmail.com

How to Cite: https://allauh.pk/

https://allauh.pk/index.php/allauh/issue/view/4

Vol. 3, No.2 || July–December 2024 ||

Published online: 31-12-2024

نظام حکومت کی اِصلاح اور حضرت مجدّد الف ثانیؒ

Transformation of Political System,In Light of The Ideas Of Hazrat Mujaddid Alf Sani

حافظ عبد الاحد تارڑ[1] پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم وِرک[2]

Abstract:

In Muslim countries, particularly Pakistan, determining which political system—be it a theocracy, Caliphate, democracy, dictatorship, or monarchy—best aligns with Islamic teachings, and who should lead such a state, remains a challenge. Over time, various political theories from Muslim scholars have been proposed, but these have consistently been rejected by the people of Pakistan in elections, including the 2024 general elections. This ongoing rejection of religious political parties has raised concerns among Islamic intellectuals and scholars about the path these parties should follow to regain their place, as the public continues to seek an Islamic state and the implementation of Islamic law.

This article suggests that religious political parties can find guidance in the theory of Sheikh Ahmad Sirhindi. His methodology, which emphasizes the creation of a state based on principles rather than religious elites, offers a possible solution. The core of his teachings is that a religious scholar can contribute to the establishment of a better government without seeking personal political power. Key elements of his approach include the training of government officials, focusing on serving the people, addressing contemporary issues, and preparing a broad base of individuals for governance.

Keywords: Caliphate, system, state, governance, thought, theocracy, Intellectuals, democracy

1- موضوع کا تعارف، اہمیت اور پس منظر:

مذہبی سیاست سے مراد ریاست کی اسلامی تشکیل ہے، لیکن اس بحث میں اہم ترین سوال یہ ہے کہ ریاست کی مذہبی بنیادوں پر تشکیل کون کرے گا؟ اس حوالے سے تاریخ ہمارے سامنے دو طرح کی تعبیرات پیش کرتی ہے۔ ریاست کی مذہبی تشکیل کے حوالے سے اوّلین تعبیر سے مراد ریاست کا وہ قدیم تصوّر ہے جسے پاپائیت یا تھیاکریسی (Papacy or Theocracy) کہتے ہیں۔ یعنی روایتی مذہبی طبقے کی حکمرانی کہ وہ ہی علم و تقوٰی کے اعتبار سے اس منصب کے اہل ہیں کہ ریاستی امور ان کے ہاتھ تھما دیئے جائیں۔ روایتی مذہبی طبقے نے جس طرح مذہب کی من مانی تعبیرات کیں اور مذہب کو اپنے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کیا، یہ

تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ یورپ کے قرون مظلمہ (Dark Ages) میں دنیا روایتی مذہبی طبقے کی حکمرانی کا مزہ چکھ چکی ہے۔

ریاست کی مذہبی تشکیل کے حوالے سے دوسری تعبیر وہ ہے جو پیغمبر آخر الزمان ﷺ کی بعثت کے بعد "ریاستِ مدینہ" کے عنوان سے تاریخ کا حصّہ ہے۔ اس تعبیر کے اعتبار سے ریاست کی مذہبی شناخت سے مراد اسلام کے اصولِ سیاست و حکومت کی حکمرانی ہے۔ مسلم مفکّرین نے اس کے لیے "الخلافۃ علی منہاج النبوۃ" کی اصطلاح استعمال کی ہے، گویا اس تعبیر کے مطابق اگر ریاستی نظم میں اسلام کے اصولِ سیاست و حکومت کارفرما ہوں تو پھر اموی خلیفہ عمر بن عبد العزیز (99- 101 ھ) اور مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر (1657- 1707ء) کا عہد حکمرانی بھی خلافت راشدہ ہی کا حصہ شمار ہوگا۔

اس تعبیر کے مطابق قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ ریاست کی مذہبی شناخت سے مذہبی طبقے کی حکمرانی مراد نہیں ہے بلکہ ریاست کی اسلامی تشکیل سے مراد اسلام کے اصولِ سیاست و حکومت کا نفاذ ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ عمل صالحین کی ایسی جماعت کے ہاتھوں ہوگا جو سیاست مُدن کے جدید تصوّرات سے آگاہ ہونے کے ساتھ دین کا گہرا علم بھی رکھتے ہوں اور ان کی تربیت اسلام کے ابدی اصولوں پر ہوئی ہو۔ لامحالہ یہ ایسے افراد ہوں گے جو نہ صرف اسلام سے گہری وابستگی رکھتے ہوں بلکہ اسلام کے لیے ان کی وارفتگی کا یہ حال ہو کہ وہ سیاست، معاشرت، معیشت غرضیکہ ہر شعبہ زندگی میں اس کے نفوذ کے خواہش مند ہوں۔ موجودہ عالمی تناظر، نیز عالمِ اسلام کے سیاسی اور فکری انتشار کی موجودگی میں اسلامی ریاست کا "خلافت" کے عنوان کے ساتھ احیاء تو تقریباً ناممکن نظر آتا ہے۔ یہ وہ زمینی حقیقت ہے جس کا ادراک کرتے ہوئے پاکستان کے تمام مسالک کے 31 ممتاز علمائے کرام نے 1951ء میں کراچی میں اپنے منعقدہ اجلاس میں نظامِ جمہوریت کو اپنے متفقہ 22 نکات کے ذریعے خلافت کے متبادل طرزِ سیاست کے طور پر تسلیم کرلیا ہے۔(1)

2- برِّ صغیر میں اسلام کی سیاسی تعبیر کا فکری تناظر:

دورِ حاضر میں قومی ریاست (Nation State) کا تصوّر اپنی حیثیت منوا چکا ہے۔ برِّ صغیر میں 1947ء کے تقسیم ہند کے فارمولے کی روشنی میں ایک الگ وطن کے طور پر پاکستان

کی تشکیل اسلام کے نام پر ایک قومی ریاست کے طور پر ہوئی۔ سوال یہ ہے کہ نظام جمہوریت اور قومی ریاست کے جدید تصوّر کو قبول کرتے ہوئے کیا ریاست کی اسلامی اصولوں پر تشکیل ممکن ہے؟ ہماری رائے میں یہ اس دور کا زندہ سوال ہے۔ اس پسِ منظر میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سماج، حکومت اور ریاست کی سطح پر اسلام کے سیاسی کردار کے حوالے سے برِّ صغیر کے اہلِ دانش کی فکر کا مختصر جائزہ اور تعارف حاصل کر لیا جائے۔

ریاست کی سطح پر اسلام کے سیاسی کردار کے حوالے سے برِّ صغیر کے علمی اُفق پر جن اہلِ علم اور ان کے افکار و نظریات نے اپنی شناخت بنائی اور اسلامیانِ ہند پر گہرے اثرات مرتب کئے ان کو ہم دو حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ان میں پہلا طبقہ علما کا ہے اور دوسرا طبقہ صوفیہ کا ہے۔ طبقۂ علما میں ایک گروہ تو وہ ہے جو علما کرام کی الگ اور مستقل دینی شناخت کے ساتھ سیاست میں حصہ لینے کا سرے سے قائل ہی نہیں، مولانا وحید الدین خان (1925۔ 2021ء) اور علامہ جاوید احمد غامدی (پ 1951ء) اس مکتبِ فکر (School of Thought) کی نمائندہ شخصیات ہیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ "اقامت دین" اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانے اور اسلام قبول کرنے کا بنیادی نہیں بلکہ اضافی مطالبہ ہے۔[2]

طبقۂ علما میں سے دوسرا گروہ وہ ہے جو مختلف گروہی اور مسلکی عصبیّتوں کے عنوانات اختیار کر کے میدانِ سیاست میں سرگرم عمل ہے۔ اس طبقے کے نزدیک اللہ تعالیٰ کو "اِلٰہ" اور "رب" ماننے اور اسلام کو ایک "دین" کے طور پر قبول کرنے کے بعد "اقامت دین" ایک بنیادی فریضہ بن جاتا ہے۔ برصغیر کے روایت پسند علما میں سے اس نقطۂ نظر کو جس شخصیت نے مربوط اور منظّم شکل میں پیش کیا ہے وہ سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ (م 1979ء) ہیں، انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کو قرآن و سنّت، سیرتِ رسول اور اسلامی تاریخ کے ایسے حوالوں کے ساتھ مربوط کر کے امّت کے سامنے پیش کیا ہے، جس کی ماضی میں کوئی مثال مشکل سے ہی ملے گی۔[3]

ریاست اور معاشرے کی اصلاح اور اسلامی تشکیل کے حوالے سے طبقۂ صوفیہ کو بھی دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے صوفیہ کرام کا ایک طبقہ تو وہ ہے جو (بعض شخصیات کے استثناء کے ساتھ) امرا، ارکانِ سلطنت اور امورِ مملکت سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلّق رکھنے کا سرے

سے قائل ہی نہیں ہے، ان کی رائے یہ ہے کہ اس نوعیت کی سرگرمیاں تربیتِ نفس اور تزکیۂ نفس کے لیے زہرِ قاتل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چشتی، سہروردی اور قادری سلاسل کے صوفیہ کرام خاص طور پر اس حوالے سے انتہائی محتاط تھے، اس رویے کی بہترین مثال حضرت نظام الدین اولیاء (م725ھ) ہیں، جو باوجود اس کے کہ عمر کا بڑا حصّہ دہلی اور اس کے قریب وجوار ہی میں مقیم رہے لیکن انھوں نے امرا، ارکانِ سلطنت اور سرکاری نمائندوں سے ملنا پسند نہیں کیا۔ آپؒ نے سلطان علاءالدین خلجی کی بار بار حاضری کی درخواست بھی قبول نہ فرمائی۔(4)

صوفیہ عظّام کا دوسرا گروہ وہ ہے جن کی رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ریاست، حکومت اور معاشروں کی اصلاح کے لیے جو ہدایات دی ہیں ان کی حیثیت محض سفارشات کی نہیں بلکہ احکام کی ہے، لہٰذا ریاست و حکومت اور معاشرے کی اسلامی اصولوں پر تشکیل کے حوالے سے دی گئی ہدایات کو کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ طبقۂ صوفیہ میں سے شیخ احمد سرہندی (971-1034ھ / 1561 - 1624ء) المعروف مجدّد الف ثانیؒ اس نقطۂ نظر کی نمائندہ شخصیت ہیں، آپؒ نے معاشرتی اصلاح کے ساتھ ریاست و حکومت کی اسلامی اصولوں پر تشکیل کا جو بیڑا اٹھایا اس نے اسلامیانِ ہند کے تشخص کے تحفّظ میں اہم کردار ادا کیا اور مسلمانوں کو ہندی تہذیب و ثقافت میں ضم ہونے سے بچایا۔ حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے ایک طرف اسلامیانِ ہند کو تہذیبی ارتداد سے بچایا تو دوسری طرف مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر (1556-1605ء) کے دور میں مذہبی رواداری کے نام پر لادینیت کی طرف پیش قدمی کرنے والی مغل سلطنت کا رخ اسلامی اصولوں کی طرف پھیرنے میں کلیدی اور فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ حضرت مجدّدؒ کا کام کئی جہات پر پھیلا ہوا تھا، ایک طرف آپؒ نے قرآن وسنّت کی دعوت دی اور شرک و بدعت کے خلاف بھرپور جدوجہد کی۔ دوسری طرف آپؒ نے علمائے سو اور صوفیائے خام کے خلاف محاذ سنبھالا اور تصوّف کو عجمی اثرات سے پاک رکھنے کی کوشش کی۔ تیسری طرف حضرت مجدّدؒ نے ریاست کا رخ بے دینی سے موڑنے کے لیے اکبر کے دینِ الٰہی کے خلاف مزاحمت کا آغاز کیا۔ زیرِ نظر سطور میں ہم شیخ احمد سرہندیؒ کی فکر کے تیسرے پہلو کا مطالعہ ایک کیس اسٹڈی کے طور پر کریں گے کہ

کیسے آپؒ نے اقتدار پر قبضہ کئے بغیر نظامِ حکومت و ریاست کی اصلاح کا عظیم الشان کارنامہ سر انجام دیا۔

3- نظامِ حکومت و ریاست کی اصلاح کا مجددی منہج و اسلوب:

نظامِ ریاست و حکومت کی اسلامی تشکیل کے بارے میں حضرت مجدّد الف ثانیؒ طبقۂ علما اور طبقۂ صوفیہ میں اپنی الگ اور منفرد رائے رکھتے ہیں۔ حضرت مجدّدؒ نہ تو ان صوفیہ اور علما سے متّفق نظر آتے ہیں جو ریاستی اور حکومتی امور کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بالکل ہی لاتعلق ہو کر گوشہ نشینی کے قائل ہیں، اور نہ ہی ان علما کرام سے متّفق ہیں جو اہلِ اقتدار اور اربابِ حل و عقد کے مدِّ مقابل ایک حریف کے طور پر سرگرم عمل ہیں۔ ان سطور میں ہم حضرت مجدّدؒ کے ان افکار و نظریات کا تذکرہ کریں گے جو آپ کو باقی اہلِ دانش سے ممتاز بناتے ہیں۔

حریف کے بجائے حلیف بن کر اصلاحِ احوال:

حضرت مجدّد الف ثانیؒ کا یہ خاص امتیاز ہے کہ انھوں نے ریاستی اور حکومتی امور کی اصلاح کے لیے اہلِ اقتدار کا حریف بنے بغیر ان کی فکری اور عملی اصلاح کی جو شاندار مثال قائم کی ہے آج کے معروضی حالات میں اس کو مشعلِ راہ بنایا جا سکتا ہے۔ پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں اہلِ اقتدار کے مدِّ مقابل ایک حریف کے طور پر کھڑی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہماری مذہبی قیادت کا اصل ہدف اصلاحِ احوال ہے یا پھر اقتدار کا حصول؟ اگر ہماری مذہبی جماعتوں اور علما کرام کا مشن دعوتِ دین اور اصلاحِ احوال ہے تو وہ حریف کے بجائے حلیف کے طور پر بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتی ہیں۔ حضرت مجدّدؒ اصحابِ فکر و دانش کے اس گروہ سے تعلّق رکھتے ہیں جن کے طرزِ عمل سے واضح ہوتا ہے کہ ریاستِ مدینہ کا قیام اور اقتدار رسول اللہ ﷺ کی برپا کردہ دعوتی تحریک کا ہدف نہیں بلکہ لازمی نتیجہ تھا۔ منصبِ اقتدار سے آپ ﷺ کی بے غرضی کا یہ حال تھا کہ آپ ﷺ نے سردارانِ قریش کی اس پیش کش کو رد فرما دیا کہ اگر وہ اپنی دعوت سے باز آ جائیں تو بدلے میں ان کو مکی ریاست کا متّفقہ حکمران تسلیم کیا جا سکتا ہے، بلکہ قریش کی پیش کش کے بر عکس آپ ﷺ نے بار ہا سردارانِ قریش کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم ایمان لے آؤ تو روم و

ایران کا اقتدار تمہارے قدموں میں ہو گا۔ اور یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ جن حکمرانوں نے اسلام قبول کیا آپ ﷺ نے ان کے اقتدار کو برقرار رکھا۔

حضرت مجدّدؒ کی دعوتی تحریک بھی پوری طرح نبوی تحریک کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی، اقتدار کا حصول کبھی بھی آپ کی ترجیحات میں نہیں رہا۔ تاریخی شہادتوں سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت مجدّدؒ کی دعوتی تحریک میں کم از کم ایسے دو مواقع ضرور پیدا ہوئے کہ اگر آپؒ چاہتے تو آگے بڑھ کر اقتدار پر قبضہ کر سکتے تھے، لیکن آپؒ کی تحریکِ دعوت کا اصل ہدف اقتدار نہیں بلکہ اہلِ اقتدار کی اصلاح تھا۔ دعوتِ دین کو اپنی زندگی کا مشن بنانے والا ایک بالغ نظر اور سچا داعی سمجھ سکتا ہے کہ یہ مقصد حریف بن کر نہیں بلکہ حلیف بن کر آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ حضرت مجدّدؒ نے اسی اسلوب کو اختیار فرمایا۔ تاریخی روایات کے مطابق جب حضرت مجدّد الف ثانیؒ گوالیار کے قلعہ میں قید تھے تو جہانگیر کے سپہ سالار نے ان کو پیش کش کی کہ اگر وہ چاہیں تو اقتدار ان کے حوالے کیا جا سکتا ہے لیکن اس مردِ دُرویش کا جواب یہ تھا کہ فقیر کو تخت و تاج سے کوئی غرض نہیں فقیر تو اربابِ اقتدار کی اصلاح چاہتا ہے۔ دوسرا موقع اس وقت پیدا ہوا جب مغل سلطنت کے نامور جرنیل مہابت خان نے دریائے جہلم عبور کرتے ہوئے شہنشاہ جہانگیر (1605 تا 1627ء) اور ملکہ نورجہاں (1577-1645ء) کو حفاظتی تحویل میں لے لیا اور حضرت مجددؒ کو اقتدار پر قبضہ کرنے کا پیغام بھیجا لیکن آپؒ نے نہ صرف ایسا کرنے سے انکار کر دیا بلکہ مہابت خان کو پیغام بھیجا کہ پورے احترام کے ساتھ بادشاہ اور ملکہ کو رہا کر دے۔(5)

حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی یہی وہ بے نفسی اور بے غرضی تھی جس نے مغلِ اعظم جلال الدین محمد اکبر کے مسلط کردہ "دین الٰہی" کو خود اس کے بیٹے جہانگیر کے ہاتھوں آخری انجام تک پہنچا دیا، گویا اقتدار کی دوڑ میں شریک ہوئے بغیر سیاسی جدوجہد کو "مجددی طریق کار" کہا جا سکتا ہے۔ آپ نے میدانِ سیاست میں اپنی بات منوانے کے لیے زور زبردستی اور طاقت کے بجائے "عدمِ تشدّد" کے اصول کو ایک کامیاب سیاسی حربے کے طور پر اختیار کیا اور اپنے مقصد میں مکمل کامیابی حاصل کی۔ ریاست کی سطح پر اسلام کے

سیاسی کردار کی واپسی کے لیے کوشاں دعوتی تحریکوں، دینی سیاسی جماعتوں اور مختلف اداروں کو مجدّدی طریقِ کار کو بھی ایک آپشن (Option) کے طور پر آزمانے کی ضرورت ہے۔

اہلِ دربار اور ارکانِ سلطنت کی تربیت سے اصلاحِ احوال:

مذاہبِ عالم میں اسلام کا یہ خاص امتیاز ہے کہ اس نے دین کی دعوت اور تحفّظ کی ذِمّہ داری کسی خاص طبقے پر عائد نہیں کی اور نہ ہی اس حوالے سے کسی خاص طبقے، نسل اور خاندان کی اجارہ داری کو تسلیم کیا ہے۔ ایک مسلمان کو اپنی عبادت اور مذہبی رسومات ادا کرنے کے لیے کسی درمیانی واسطے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ فطرتِ انسانی کے سب سے بڑے رازدان حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے ہدایت فرمارکھی ہے کہ جمعۃ المبارک کا خطبہ بھی قاضی اور خطیب کے بجائے حاکمِ وقت دے۔ دینِ اسلام پر کسی پجاری، پروہت، بھگشو، سادھو یا کسی طبقے کی اجارہ داری تسلیم کرنے کی بجائے اس کو پوری انسانیت کا مشترکہ ورثہ قرار دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کا جب بھی کسی طاغوتی طاقت سے ٹکراؤ ہوا تو اس کے تحفّظ کے لیے محض "مذہبی جماعتیں" نہیں بلکہ پوری امت اٹھ کھڑی ہوئی۔ عالمِ اسلام اور خاص طور پر برِّ صغیر کی تاریخ گواہ ہے کہ یہاں اسلامی اقتدار کی ترویج اور دین کے تحفّظ کے لیے "دنیادار" مسلمانوں نے شاندار خدمات انجام دی ہیں۔

مغل حکمران جلال الدین محمد اکبر کے دور میں بادشاہ سمیت دیگر لوگوں کے عقائد و نظریات بگھاڑنے میں جہاں شیخ ملا مبارک (م1001ھ) اور اس کے بیٹوں ابوالفیض فیضی بن مبارک (م1004ھ)، ابوالفضل بن مبارک (م1011ھ) اور دیگر نام نہاد علمائے سو کا کردار تھا، تو وہاں مغل دربار ہی سے وابستہ بہت سارے ارکانِ سلطنت نے صورتِ حال کو سنبھالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ شیخ فرید الدین (م1025ھ)، خانِ اعظم مرزا عزیز کوکہ (م 1033ھ)، میرزا عبد الرحیم خانِ خاناں (م1026ھ)، میر محمد نعمان بدخشیؒ (م 1057ھ)، خان جہان خان لودھی، (م1040ھ) مرزا داراب، گورنرِ لاہور قلیچ خان اور دیگر کئی نامور امرا اور ارکانِ سلطنت نے اپنے ذاتی مفادات پسِ پشت ڈال کر نظامِ حکومت و ریاست کی اسلامی اصولوں پر استواری پر اصرار کیا اور مغل حکمرانوں کو یہ احساس دلانے میں کامیاب رہے کہ ہندوستان کا تہذیبی ارتقاء اور حکومت و ریاست کی اثر انگیزی دینِ اسلام کے سنہری اصولوں میں ہی پوشیدہ ہے۔

مجدّدی سیرت نگاروں اور دیگر مؤرخین نے واضح کیا ہے کہ دورِ اکبری اور بعد ازاں جہانگیر کے دورِ حکومت میں حضرت مجدّد الف ثانیؒ کو نا صرف اعلیٰ حلقوں تک رسائی حاصل تھی بلکہ سلطنت کے مقتدر افراد کے ساتھ آپ کے ذاتی روابط کا مضبوط سلسلہ قائم تھا۔ آپؒ نے ان تعلّقات کو ذاتی مفادات اور مراعات کے حصول کا ذریعہ بنانے کی بجائے نظامِ ریاست کی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ حضرت مجدّدؒ نے پہلا کام یہ کیا کہ انھوں نے اپنے ارادت مند امرائے دربار کی شعوری تربیت کی۔ آپؒ نے ان کے اندر اسلام کی تعلیمات سے آگاہی حاصل کرنے، اسلام کو اپنی زندگی میں اپنانے، معروفات پر عمل پیرا ہونے اور منکرات سے بچنے کا شعوری جذبہ ابھارا۔ حضرت مجدّدؒ اپنے مقصد کے حصول اس وجہ سے بھی آسانی ہوئی کہ زیادہ تر درباری امرا حضرت باقی باللہؒ (م 1603ء) کے مخلصین اور ارادت مند تھے اور انھیں سے فیض یافتہ تھے۔ شاہی دربار میں پھیلی ہوئی بے دینی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں یہ لوگ امید کی کرن تھے۔ لازم تھا کہ ان امرا کا نہ صرف تزکیہ نفس کیا جائے بلکہ ان کو درباری علما، جو اپنی ذاتی اغراض کے دھوکے میں راہِ حق سے ہٹ چکے تھے، کے مقابلے میں عقلی اور علمی دلائل سے آراستہ کیا جائے۔ علمی اور فکری تربیت اور اصلاحِ احوال کے لیے حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے مختلف سیاسی شخصیات کو جو مکتوبات رقم فرمائے ان کو ہم تین حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

ایک، آپ نے ارکانِ سلطنت کو جو مکتوب صادر فرمائے ان میں آپ کے پیشِ نظر مکتوب الیہ کے عقیدہ و فکر کی حفاظت کے علاوہ تربیتِ نفس اور کردار کی تطہیر تھا۔ شیخ فرید الدین، میرزا عبد الرحیم خانِ خاناں، میر محمد نعمان بدخشیؒ، اور خواجہ جہاں جیسی شخصیات کے نام خطوط اسی نوعیت کے تھے۔

دوسرے، آپؒ کے صادر کردہ مکتوبات میں مکتوب الیہ کے لیے ترغیب و ترہیب اور دعوت و تحریک کا پہلو نمایاں ہے۔ اس نوعیت کے زیادہ تر مکتوب شیخ فرید الدین، خانِ اعظم مرزا عزیز کوکہ،، میر محمد نعمان بدخشیؒ، خان جہان خان لودھی، لالہ بیگ (1016ھ) اور صدر جہاں وغیرہ کے نام ہیں۔

تیسرے، آپؒ کے مکتوبات کی ایک قسم وہ ہے جو آپؒ نے قید خانے اور لشکرِ شاہی سے اپنے صاحبزادوں کے علاوہ شیخ بدیع الدین، میر مظفر خان، خواجہ حسام الدین احمد (م 1633ء) اور شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ (م 1642ء) وغیرہ کے نام رقم فرمائے۔

حضرت مجدّدؒ نے اپنے مریدِ خاص اور خلیفہ میر محمد نعمان بدخشیؒ، جو مغل دربار میں خاص اثر و رسوخ رکھتے تھے، کو تینتیس (33) خطوط روانہ فرمائے۔ اسی طرح مغل دربار کی ایک اور انتہائی بااثر شخصیت اور اپنے عقیدت مند میرزا عبد الرحیم خانِ خاناں کے نام آپؒ نے تیرہ (13) خطوط رقم فرمائے۔ خانِ خاناں وہ شخصیت ہیں جنھوں نے ابو الفضل کا ناطقہ بند کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مرزا عزیز کوکہ، جو کہ بادشاہ اکبر کا رضاعی بھائی تھا، کے نام بھی حضرت مجددؒ کے دو خطوط ریکارڈ کا حصّہ ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر کئی مشاہیر کے نام دعوتی خطوط روانہ فرمائے جن میں اپنے سینہ کھول کر رکھ دیا اور ارکانِ سلطنت کو ان کی ذِمّہ دارایوں کا احساس دِلایا اور ان کی ایسی ذہن سازی اور فکری رہنمائی فرمائی کہ بالآخر مغل دربار کی مقتدرہ (Establishment) کی تربیت کے بعد ان کو نظامِ ریاست و حکومت کی اصلاح پر آمادہ کرلیا، جس کے نتیجے کے طور پر مغل دربار میں آپؒ کی فکر کو فیصلہ کن غلبہ حاصل ہو گیا۔ مغل دربار کی وہ خوش نصیب شخصیات جن کو اصلاحِ احوال کے لیے حضرت مجدّدؒ نے وسیلے کے طور پر استعمال کیا ان میں سے چند نمایاں ترین نام حسبِ ذیل ہیں:

سید فرید بخاریؒ (م1025ھ) وہ شخصیت ہیں جو اکبری دور اور بعد ازاں جہانگیر کے دور میں دربار میں خاص اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ ان کے نام حضرت مجددؒ نے کثرت سے خطوط رقم فرمائے۔ شیخ فرید ریاست کے ایک اہم ترین رکن تھے۔ جو اکبر کے زمانہ میں میر بخشی (تنخواہ تقسیم کرنے والا) تھے۔ تخت نشینی کے بعد سب سے پہلے جن پر انعام واکرام کیا گیا، اُن کا تذکرہ کرتے ہوئے جہانگیر لکھتا ہے کہ فرید بخاری جو میرے والد کی خدمت میں میر بخشی تھے، میں نے اُن کو لباسِ فاخرہ ہیرے اور جواہرات سے جڑی ہوئی دوات و قلم مرصع مرحمت فرما کر اُسی خدمت پر بحال رکھا۔ اور اُن کی سربلندی کے لئے مابدولت (بادشاہ خود) نے فرمایا کہ مابدولت تم کو صاحب السّیف والقلم جانتے ہیں۔ اس لقب کا پس منظر یہ ہے کہ جب جہانگیر کا بڑا لڑکا خسرو باغی ہو گیا

اور اس کے تعاقب میں خود جہانگیر کو نکلنا پڑا تو اس فوج میں ہر اول دستے کے افسر اعلیٰ خود شیخ فرید تھے۔ جہانگیر سے چند گھنٹے پہلے شیخ فرید نے لاہور پہنچ کر خسرو کی بہت بڑی فوج کو اپنی تھوڑی سی فوج کے ساتھ اس قدر پھرتی سے شکست دی کہ لوگوں کو یقین نہ آیا اس کارنامے کے بعد ہی جہانگیر نے ان کو صاحب السّیف والقلم کا لقب عطا ہوا۔ حضرت مجدّدؒ نے بادشاہ کی اصلاح کے سلسلہ میں اس کے سب سے زیادہ مقرب رکنِ سلطنت سید فرید بخاری کو وسیلہ بنایا۔ کیونکہ جہانگیر فرید بخاری کے اثر و رسوخ سے اکبر کا جانشین بنا تھا، اس لیے اب سب سے زیادہ اہم شخصیت اُسی کی تھی، ان کی سیادت اور دینی غیرت سے حضرت مجددؒ نے فائدہ اٹھا کر ان کو اپنا دینی و خاندانی فرض ادا کرنے پر آمادہ کیا اور یہ کہ وہ جہانگیر کو مشورہ دے کہ سلطنت کا رخ اکبر کے ڈالے ہوئے راستے پر چلتے رہنے اور اسلام کے تقاضوں سے چشم پوشی اور بے تعلّقی میں نہیں ہے، آپؒ نے فرید بخاری کو متوجہ کیا کہ وہ بادشاہ کو قائل کریں وہ اسلام اور مسلمانوں کی دست گیری فرمائیں۔ حضرت مجدّدؒ سید فرید بخاری کے نام ایک مکتوب میں جو غالباً جہانگیر کی تخت نشینی کے فوراًبعد لکھا گیا آبائے کرام اور خاص طور پر سید الکونین ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر ثابت قدم رہنے کی دعا دینے کے بعد لکھتے ہیں :

"بادشاہ کو عالم سے وہی نسبت ہے جو دل کو بدن سے ہے، اگر دل صحیح و صالح ہے تو بدن بھی صحیح و صالح ہے، اور اگر وہ فاسد ہے تو بدن بھی فاسد ہو گا بادشاہ کی اصلاح، عالم کی اصلاح ہے اور اس کا فساد عالَم کا فساد ہے۔ آپ کو خوب معلوم ہے کہ سابقہ دور (عہدِ اکبری) میں اہلِ اسلام کے سر پر سے کیا مصیبت گزری ہے، اس سے پہلے کی صدیوں میں غربتِ اسلام کے باوجود اہلِ اسلام کی ذلت و خواری اس سے زیادہ نہ ہوئی تھی، اس زمانہ میں زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ مسلمان اپنے دین پر رہیں اور اہلِ کفر اپنے طریق پر لیکن قرنِ ماضی میں اہلِ کفر غالب آکر کھلم کُھلا دار الاسلام میں احکام کفر کا اجرا کرتے تھے اور مسلمان، اسلام کے احکام کے اظہار سے بھی مجبور تھے اگر کوئی ہمت بھی کرتا تو موت کی سزا پاتا تھا۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے ماننے والے ذلیل و خوار تھے، اور آپ ﷺ کے نبوت کا انکار کرنے والے

باعزت و با اعتبار۔ مسلمان اپنے زخمی دلوں کے ساتھ اسلام کی نوحہ خوانی میں مصروف تھے اور دشمنانِ اسلام تمسخر و استہزا کے ساتھ ان کے زخموں پر نمک چھڑک رہے تھے، آفتابِ ہدایت گمراہی کے پردہ میں چھپا ہوا اور نورِ حق باطل کے پردوں میں چھپا ہوا تھا۔ آج جبکہ اسلام کے اقتدار سے جو چیز مانع تھی، اس کے دور ہو جانے اور بادشاہِ اسلام کے برسر آرائے سلطنت ہونے کا مژدہ خاص و عام کے کانوں تک پہنچا ہے، اہلِ اسلام اپنی ذِمّہ داری سمجھ کر بادشاہ کے مددگار بنیں اور شریعت کی ترویج اور ملت کی تقویت کا راستہ دکھائیں، یہ امداد و تقویت خواہ زبان سے میسر آئے خواہ ہاتھ سے------ماضی قریب میں جو مصیبت بھی سر پر آئی وہ علمائے سو کی جماعت کی نحوست سے پیش آئی، بادشاہوں کو یہی لوگ راہِ راست سے ہٹا دیتے ہیں، امت میں جو بہتر فرقے بنے اور انھوں نے جو راہِ گمراہی اختیار کی ان کے پیشوا یہی علمائے سو تھے، علما میں سے کم ایسے گمراہ ہوں گے جن کی گمراہی دوسروں پر اثر نہ کرے، اس زمانہ کے اکثر جہلا صوفی نما بھی علمائے سو کا اثر رکھتے ہیں ان کا فساد بھی متعدی فساد ہے اگر کوئی شخص اس کارِ خیر (اعانتِ دین) میں دین کی سربلندی کے لیے استطاعت رکھتے ہوئے اگر اس میں کوتاہی سے کام لیتا ہے، اور کارخانۂ اسلام میں فتور واقع ہوتا ہے وہ کوتاہی کرنے والا بھی قابلِ شکایت ہوگا، اس بنا پر یہ حقیر بھی چاہتا ہے کہ وہ سلطنت اسلام کی مدد کرنے والوں کے گروہ میں شامل ہو، اور اپنی بساط کے مطابق ہاتھ پاؤں مارے کہ من کثر سواد قوم فھو منھم کیا عجب ہے کہ اس بے استطاعت کو اس عالی جماعت میں شامل کرلے، وہ اپنی مثال اس ضعیفہ کی طرح سمجھتا ہے جس نے کچھ رسیاں بٹ کر اپنے کو خریدارانِ یوسف کے گروہ میں شامل ہونا چاہا تھا، امید ہے کہ جلد ہی یہ فقیر آپ کی خدمت میں حاضر ہوگا۔"اس مکتوب کے آخری جملے میں کس قدر درد کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کی اصلاح کے لیے بادشاہ کو شریعت اسلامی سے آگاہ کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے

:"آپ سے اس کی توقع ہے کہ چونکہ آپ کو بادشاہ کا قرب خاص حاصل ہے، اور ان باتوں کے گوش گزار کرنے کے مواقع میسر ہیں، خلوت و جلوت میں شریعت محمدی کی ترویج کی کوشش کریں گے اور مسلمانوں کو اس غربت و بے بسی سے نکالیں گے "(6)

مذکورہ بالا مکتوب میں مجدّد صاحبؒ نے یہ بحث اس لیے کی، کیونکہ بادشاہ اکبر کم عمری میں ہی تخت نشین ہو گیا تھا، باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا وقت نہ مل سکا۔ اکبر کے اتالیق اور مشہور مغل جرنیل بیرم خاں اور دوسرے درباری امرا اکبر پہ چھا گئے اور من مانی سے قوانین بنوانے لگے، مگر مسلمان اور اسلام قدرے دب گیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اکبر نے ہندو عورتوں سے شادیاں کیں، جس ہندوؤں اثر ورسوخ بڑھتا گیا اور وہ مزید دلیر ہو گئے۔ علمائے سو کی فتنہ انگیزیوں کے نتیجے میں من مانی تاویلات اختیار کر کے دینِ الٰہی کی بنیاد رکھ دی گئی، زیر نظر مکتوب سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت مجدّدؒ کے نزدیک اراکینِ دولت کی اصلاح بادشاہ کی اصلاح سے مقدم تھی کیونکہ فساد کا اصلی سبب یہی لوگ تھے۔ حضرت مجدّدؒ شیخ فرید بخاری کے نام ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:

"حق سبحانہ وتعالیٰ سے دعا ہے کہ بزرگانِ اہل بیتِ نبوی ہی کی اولاد کے ذریعے سے شریعت کے ارکان اور ملتِ بیضا کے احکام قوت پکڑیں اور رواج پذیر ہوں۔ اس وقت غریب اہلِ اسلام جو اس گرداب میں گرفتار ہیں نجات کی امید اہل بیت ہی کے سفینہ سے لگائے ہوئے ہیں، حضور ﷺ کا ارشاد ہے: "مثل اھل بیتی کمثل سفینۃ نوح من رکبھا نجا ومن تخلف عنھا ھلک "بلند ہمتی کو اسی اعلیٰ مقصد کے لیے کام میں لائیں کہ یہ سعادتِ عظمیٰ ہاتھ آئے، اللہ کی عنایت سے ہر طرح کا جاہ و جلال اور عظمت و شوکت آپ کو میسر ہے، اس شرفِ ذاتی (سیادت خاندانی) کے ساتھ اگر یہ سعادت بھی شامل ہو جائے تو سب سعادت مندوں سے بازی لے جائیں، یہ حقیر اسی طرح کی باتوں کے التماس و گذارشات کے لیے جن کا مقصد

تائید و ترویجِ شریعت ہے آپ کی خدمت میں آنے کا ارادہ رکھتا ہے۔"(7)

شیخ فرید ہی کے نام ایک اور مکتوب میں حضرت مجددؒ فرماتے ہیں:

"یوں تو جس زمانہ اور جس شخص سے بھی ترویجِ دین اور تقویتِ ملّت کی خدمت انجام پائے، بہتر ہے۔ لیکن بے بسیٔ اسلام کے موجودہ دور میں آپ جیسے جوان مردانِ اہلِ بیت کے لیے ترویجِ دین اور تائیدِ ملّت زیب دیتا ہے اور آپ جیسوں ہی کا مخصوص کام ہے کیونکہ یہ دولت آپ ہی کے خاندانِ مقدّس کی خانہ زاد ہے۔ آپ ہی کے طفیل سے دوسروں نے یہ دولت حاصل کی ہے۔ اسی جلیل الشّان خدمت کی انجام دہی رسول اللہ ﷺ کی حقیقی اور سچی وراثت ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔ آج وہ زمانہ ہے کہ اگر امر و نہی کا دسواں حصّہ بھی چھوڑ دو گے تو تباہ ہو جاؤ گے لیکن اس کے بعد وہ زمانہ آئے گا کہ اگر دس میں سے ایک کو بھی انجام دے لیں گے تو نجات پا جائیں گے۔" مکتوب کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں: "بادشاہِ اہلِ اسلام کی توجہ اہلِ کفر کی جانب نہیں رہی ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے، رسوماتِ کفر کی قباحت پوری طرح بادشاہ کے ذہن نشین کرا دیں، اور اگر ضرورت سمجھیں تو کسی عالم کو بلا لیں۔ احکامِ شرعی کی تبلیغ کے لیے کرامتوں کا اظہار ضروری نہیں اگر افہام و تفہیم اور ارشاد و تبلیغ کے سلسلہ میں کوئی جماعت تکلیف بھی برداشت کرے تو اُس کی عین سعادت ہے، کیا انبیاء نے تکالیف برداشت نہیں کیں؟ حضور ﷺ کا ارشاد تو یہ ہے کہ جس قدر تکلیف مجھ کو دی گئی، کسی نبی کو نہیں دی گئی۔"(8)

خانِ اعظم (م1033ھ) شیخ فرید بخاری کے بعد مغل دربار کی ایک بڑی شخصیت تھے، اصل نام عزیز مرزا محمد تھا۔ خانِ اعظم امرائے اکبری میں سے تھے۔ عہد جہانگیری میں بھی حکومت کے عظیم الشّان رکن تھے۔ خانِ اعظم شہنشاہ اکبر کے رضاعی بھائی تھے، اکبر اسے دوسرے تمام رضاعی بھائیوں سے زیادہ عزیز اور قابلِ احترام

سمجھتا تھا۔ خانِ اعظم نے مختلف سیاسی و جنگی کارنامے انجام دیے۔ جن کے صلہ میں پنج ہزاری منصب اور خانِ اعظم کا خطاب عطا ہوا۔ اکبر کی حرکات اور پالیسیوں سے اسے سخت اختلاف رہتا مگر جہاں ایسے اختلافات دوسرے امرا پر عتاب کا باعث بن جاتے تھے اکبر اس سے درگزر کرتا اور کہتا کہ میرے اور عزیز کے درمیان جوئے شیر حائل ہے۔ حضرت مجدّدؒ نے خانِ اعظم کو جو خطوط تحریر فرمائے ہیں وہ نہ صرف آپؒ کی دینی حمیت کا ثبوت ہیں بلکہ اکبری فتنوں کا سدِّ باب کرنے کے لیے بر وقت حکیمانہ تجاویز بھی ہیں۔ بد قسمتی سے جہانگیر کی تخت نشینی کے ابتدائی ایام میں زمانہ سابق کی طرح اسلام کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ کھلم کھلا اسلامی تعلیمات پر طعن کیا جا رہا تھا اور بے باک اور نڈر ہو کر کفر کی تعریف کی جا رہی تھی، اسلام اور اہلِ اسلام چھپے پھرتے تھے، ایسے حالات کو حضرت مجدّدؒ جیسے درد مند انسان کیسے برداشت کر سکتے تھے مجدّد صاحبؒ خانِ اعظم کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> "ہم ایسے نازک وقت میں آپ کے وجودِ مبارک کو غنیمت جانتے ہیں اور اس معرکۂ ضعیف اور شکست خوردہ میں آپ کے سوا کسی کو بہادر اور لڑا کا نہیں جانتے۔ حق تعالیٰ اپنے نبی ﷺ اور ان کی آلِ پاک کے طفیل آپ کا مددگار اور حامی و ناصر ہو۔ حدیث مبارکہ بطور تبرک ان کو نصیحت فرماتے ہیں "لَن یُؤمِن اَحَدَکم حتی یقال انہ مجنون" فرمایا اس وقت وہ دیوانہ جو جنون کی حد تک اسلام کی غیرت رکھتا ہے وہ صرف تم ہی ہو اسلام پر اس غربت کے دور میں اسلام کی حفاظت کے لیے تھوڑا سا عمل بڑے اجر کا سبب ہے۔ یہ قولی جہاد جو آپ کو میسّر ہے یہی جہاد اکبر ہے اس کو غنیمت جانیئے اور اس کو جہادِ قتال سے بہتر سمجھیں ہم جیسے بے دست و پا فقرا اس دولت سے محروم ہیں۔ اہلِ کفر کے وہ احکام جو اہلِ اسلام میں رواج پا چکے ہیں ان کو ختم کرنے کی کوشش کریں تا کہ مسلمان ان بے ہودہ افعال سے محفوظ رہیں۔"(9)

خان جہان لودھی (م1040ھ) مغل دربار کی ایک نامور شخصیت تھے، پیر خان نام تھا اور دولت خان لودھی کا دوسرے بیٹے تھے۔ پہلے شہزادہ دانیال کے وابستگانِ دامن میں

شامل تھے، اس کی وفات کے بعد جہانگیر کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ جہانگیر تخت پر بیٹھا تو انھیں سہ ہزاری منصب اور صلابت خاں کا خطاب عطا ہوا۔ اس کے بعد اعلیٰ خدمات کے صلہ میں پنج ہزاری منصب اور خان جہان کے خطاب سے متمکن ہوئے۔ جہانگیر کے ساتھ اس کے تعلقات دوستانہ تھے۔ اس کے مزاج میں اسے بڑا اعتبار حاصل تھا اور نہایت متدیّن اور حق پرست تھے۔ ان کی راتیں بالعموم علما اور صوفیہ کرام کی صحبت میں گزرتیں۔ کتاب وسنّت کی اتباع کرنے والے تھے۔ ان کی مجالس بدعات سے بالکل پاک ہوتیں۔ خان جہاں جو سلطانِ وقت کے مقرّبینِ خاص میں سے تھے اور جہانگیر جن کی بات کو سنتا اور مانتا تھا، حضرت مجدّدؒ نے انھیں جہانگیر کو مذہبِ اسلام کی طرف راغب کرنے کے لیے ایک مکتوب لکھا۔ مکتوب میں اسلام کے جملہ عقائد وعبادات کو نہایت ہی سلیس اور سنجیدہ طور پر اس طرح سمجھایا گیا ہے کہ گویا تبلیغ و مناظرہ کے لیے خان جہان کو تیار کر رہے ہیں۔ مکتوب کے آخر میں پھر اپنے مطلب پر آتے ہوئے فرماتے ہیں:

> " اب میں اصلی بات پر آتا ہوں اور کہتا ہوں کہ آپ کو معلوم ہے کہ بادشاہ مثل روح کے ہے اور باقی انسان بمنزلہ جسم کے اگر روح ٹھیک ہوتی ہے تو جسم بھی صحیح سلامت رہتا ہے، اور جب روح میں کوئی خرابی آجاتی ہے تو جسم بھی خراب ہو جاتا ہے، پس بادشاہ کی اصلاح کی کوشش کرنا دراصل تمام انسانوں کی اصلاح کی کوشش کرنا ہے اور یہ اصلاح اس طرح ہو سکتی ہے کہ جب موقع ملے اور گنجائش نظر آئے صحیح اسلامی تعلیمات ان کے کان میں ڈالی جائیں، اور مخالفین کے مذاہبِ باطلہ کا رد کیا جائے، اگر یہ دولت آپ نے حاصل کی تو سمجھیے کہ آپ کو انبیاء علیہم السّلام کی وراثت مل گئی، بڑی سعادت ہے کہ آپ کو یہ دولت مفت مل رہی ہے اس کی قدر جانی چاہیے۔"(10)

اسی طرح ایک اور مکتوب میں اس دولت کی اہمیت کو نہایت ہی پر زور الفاظ میں بیان کیا ہے:

"یہی ملازمت (قربتِ بادشاہ) جو آپ رکھتے ہیں اگر اس کو محمد مصطفی ﷺ کی شریعت کی تعمیل کے ساتھ جمع کر دیں تو آپ انبیاء علیہم الصّلوۃ والسّلام جیسا کام کریں گے۔ ہم فقیر لوگ اگر کئی سال تک بھی اس پر عمل کرنے میں اپنی جان لڑادیں تو آپ جیسے شہبازوں کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔"(11)

لالہ بیگ (م1016ھ) بھی مغل دربار کی ایک اور پر اثر شخصیت تھی۔ باز بہادر لقب تھا۔ جہانگیر کے اکابر امرا میں شمار ہوتا تھا۔ لالہ بیگ بنگال کی صوبہ داری پر فائز تھے۔ صاحبِ نظر اور اسلامی جوش و جذبہ سے بہرہ مند اور حق پرست تھے۔ ہمیشہ اچھے اور پسندیدہ کام سر انجام دیتے تھے۔ حضرت مجدّدؒ لالہ بیگ کے مزاج اور فطرتِ سلیمہ کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ان کو ہندوستان میں گذشتہ سو سال سے اسلام کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی تفصیل لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تقریباً ایک صدی سے اسلام کی غربت اور پستی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ بلادِ اسلام میں کفّار صرف احکامِ کفر کے اجرا پر راضی نہیں ہوتے۔ بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی احکام بالکل مٹ جائیں اور مسلمانوں اور مسلمانی کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔ اور ان کی جرات و بے باکی یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی مسلمان شعارِ اسلام کے اظہار کی دلیری کرتا ہے تو قتل کر دیا جاتا ہے۔ گائے کا ذبیحہ جو ہندوستان میں اسلام کے اعظم شعائر میں سے ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ کفّار شاید جزیہ ادا کرنے پر راضی ہو جائیں مگر گائے کے ذبیحہ پر کبھی راضی ہونے کو تیار نہیں۔ ابتدائے بادشاہت ہی میں اگر مسلمانی رواج پذیر ہو گئی اور مسلمانوں نے کچھ حیثیت پیدا کر لی تو فبہا اور اگر معاملہ سستی اور توقف میں پڑ گیا تو مسلمانوں پر سخت برے دن آجائیں گے۔ الغیاث الغیاث ثم الغیاث الغیاث اللہ کی بارگاہ میں فریاد فریاد، پھر فریاد فریاد۔ دیکھیے کون صاحبِ قسمت اس دولت (ترویجِ اسلام) سے سرفراز ہوتا ہے۔ اور کس شہباز کا ہاتھ

اس دولت تک پہنچتا ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔"(12)

اس مکتوب میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ اکبر بادشاہ کے دور میں علمائے سو کی کارستانیوں کی وجہ سے اسلامی شعائر کا نہ صرف مذاق اڑایا جانے لگا تھا۔ بلکہ گائے کے ذبیحہ پر مسلمانوں کو قتل بھی کر دیا جاتا تھا۔ لیکن حضرت مجددؒ کی جدوجہد سے جہانگیر کی صورت میں ایک بادشاہ مسندِ سلطنت پر متمکّن ہوا جس کے قریب میں اس کے وہ مقرّبین تھے جن کی عقیدت حضرت مجدّدؒ سے تھی اور وہ اسلام سے والہانہ محبّت رکھتے تھے اور آپؒ کے ارشادات پر عمل کرنے کو اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ اب پچھلے تجربات کو دہرانے کی بجائے شروع ہی سے بادشاہِ وقت کے مزاج کو اسلام سے آشنا کرنا ضروری ہے اور اس سے پہلے کہ کوئی شر پسند انسانوں کا گروہ اس کا قرب حاصل کر کے اس کو صراطِ مستقیم سے بھٹکا دے ابھی سے اسلامی شعائر کی عظمت اس کے دل میں جاگزیں کر دی جائے، جو اسلام کی ترویج اور اشاعت میں معاون ثابت ہو سکے۔ حضرت مجددؒ کا خیال تھا کہ دورِ جہانگیری میں وہ برائیاں نہ پنپ سکیں جو عہدِ اکبری میں رواج پذیر ہو چکی تھیں۔ حضرت مجدّدؒ نے جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد بہت سی توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ حضرت مجدّدؒ چاہتے تھے کہ مغل دربار میں فوراً تبدیلیاں لائی جائیں اور ہندو جو کہ اکبر کے بعد سہمے ہوئے تھے، مملکت پر ان کے اثر و رسوخ کو فوراً ختم کر دیا جائے اس قسم کے خیالات کا اظہار انھوں نے جہانگیر کے معتمد خاص اس کے بچپن کے استاد اور منصب چہار ہزاری پر فائز شخصیت صدر جہاں کے نام ایک مکتوب میں کیا۔

مفتی صدر جہاں (م1027ھ) وہ بزرگ ہیں جن کو اکبر نے وفات کے وقت خاص طور سے کلمۂ شہادت پڑھوانے کے لیے بلوایا تھا۔ اور پھر اس بنا پر کہ یہ سید تھے اور اکبر کے زمانہ میں مدتوں صدارتِ افتاء کے منصب پر فائز رہے تھے۔ جہانگیر نے بھی ان بدستور منصبِ صدارت پر فائز رکھا اور کچھ اختیارات میں مزید توسیع کر دی اور پھر اُن کو مذہبی احترام کی بنا پر قاضی القضاۃ کا عہدہ بھی تفویض کیا، اور ان کو سجدۂ شاہی بجالانے سے بھی مستثنیٰ کر دیا تھا۔ حضرت مجدّدؒ صدر جہاں کے اس مقام مرتبہ کی وجہ سے

اصلاحِ احوال کے لیے ان سے بڑی امیدیں وابستہ رکھتے تھے، چناں چہ ان کے نام اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"اب جب کہ سلطنت میں انقلاب رونما ہو گیا ہے اور اہلِ مذاہب کے عناد کی تیزی ختم ہو چکی ہے آئمہ اسلام، وزرا اور علما کرام کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی پوری توجہ احکام شرعیہ کی ترویج پر لگا دیں اور اوّلین فرصت میں اسلام کے ان ارکان کو قائم کریں جو عہدِ ماضی میں منہدم کر دیے گئے تھے، ہم بے کس اس معاملہ میں تا سر توقف سے سخت بے چین ہیں، جب کہ بادشاہانِ اسلام ہی میں سنّتِ نبویہ کی ترویج کا جذبہ نہ ہو اور ان کے مقرّبین بھی اس بارے میں کچھ نہ کریں تو اسلام کے نام لیواؤں کے لیے کام کرنا بہت دشوار ہو جائے گا۔"(13)

میرزا عبدالرحیم خانِ خاناں (م1026ھ) اکبر بادشاہ کے مشہور اتالیق بیرم خان کے فرزند تھے۔ بیرم خان شیعہ مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر خانِ خاناں سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت تھے۔ حضرت امام ربانیؒ اپنے مکتوبات میں انھیں اسی طرح یاد فرماتے ہیں جس طرح ایک مخلص مرید کو متوجہ کیا جاتا ہے۔ خانِ خاناں ریاستی امور میں اس قدر دخیل تھے گویا صاحبِ اقتدار اور سلطنت کے مالک ہیں۔ قدرت نے پہلے ہی سے اہلِ علم و تقویٰ کی خدمت کرنا ان کے دل میں ڈالا ہوا تھا۔ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبانوں میں کافی مہارت رکھتے تھے، فارسی اور ہندی میں شعر بھی کہتے تھے۔ شعر و ادب کی قدر کرتے اور شاعروں کو انعامات سے نوازا کرتے۔ ایک دفعہ بادشاہ جہانگیر ان سے بہت خفا ہو گیا اور دربار میں حاضری کا حکم دیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بادشاہ انھیں قتل کرا دے گا۔ خان خاناںؒ نے اس واقعہ کو حضرت مجدّدؒ کے گوش گزار کر کے دعا کی درخواست کی، خدا کا فضل شاملِ حال ہوا۔ بارگاہ میں پیش ہوتے وقت غیظ و غضب میں آکر موت کا حکم دینے کی بجائے خانِ خاناں کو خلعت عطا کی۔

میرزا عبدالرحیم خانِ خاناںؒ سیاسی اعتبار سے معمولی آدمی نہ تھے۔ نہ صرف اپنی خاندانی خدمات کی وجہ سے بادشاہ پر ان کے گہرے اثرات تھے بلکہ اپنی فطری بہادری، بلند فکری، علما و صوفیہ کرام سے محبّت اور فقرا و مساکین کی دادرسی کی وجہ سے ہر طبقہ

میں مقبولیت کی اس سطح پر تھے جس سے زیادہ کا سوچا بھی نہیں جا سکتا، لیکن اس کے باوجود حضرت مجددؒ نے ان کی طرف جو خطوط صادر فرمائے، ان میں اس بات کا ادنیٰ سا شائبہ بھی نہیں ہے جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہو کہ آپؒ خانِ خاناں کی اس حیثیت سے فائدہ اٹھا کر اقتدار یا کسی ذاتی منفعت کے خواہاں ہوں۔ حضرت مجددؒ نے ہمیشہ یہ کوشش فرمائی کہ خانِ خاناں کی شخصی حیثیت سے فائدہ اُٹھا کر دربارِ شاہی سے وابستہ دیگر لوگوں کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔ حضرت مجددؒ نے اپنے ایک مکتوب میں میرزا عبدالرحیم خانِ خاناںؒ کو اس طرف توجہ دلائی کہ آپ کے ایک فاضل شاعر دوست کے بارے معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے اپنا لقب "کفری" اختیار کر رکھا ہے جو کہ کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔ پھر آپؒ نے خانِ خاناںؒ کو تحریر فرمایا کہ اس شاعر کو میری طرف سے پیغام پہنچا دیں کہ اس طرح کا کافرانہ تخلّص بدل کر کوئی ایسا اسلامی لقب اختیار کریں جو جامع برکات ہو۔(14)

حضرت مجدّدؒ کی کوششوں سے آخر وہ مبارک وقت آیا کہ جہانگیر کو غلطی کا احساس ہوا اور اس نے اپنی حکومت و انتظام سلطنت کے یہ چاہا کہ علما کی ایک جماعت دینی امور میں مشورہ دینے اور غلطیوں سے بچانے کے لیے دربار میں موجود رہے اس نے دیندار ارکانِ سلطنت سے فرمائش کی کہ چار دیندار علما کو تلاش کر کے دربار میں ہر وقت حاضر رہنے پر آمادہ کریں، جو مسائلِ شرعیہ کی وضاحت کریں اور ضرورت پڑنے پر ان سے رہنمائی حاصل کی جاتی رہے۔ حضرت مجدّدؒ کو اللہ تعالیٰ نے فراستِ صادقہ اور اعلیٰ دینی بصیرت عطا فرمائی تھی اور سابق سلطنت کے انحراف کی تاریخ اور اس کے اسباب پر ان کی گہری نظر تھی، یہ اطلاع سن کر بجائے مسرور ہونے کے فکر مند اور پریشان ہو گئے۔ مجدّد صاحبؒ نے ایک خط شیخ فرید کو اور ایک خط نواب صدر جہاں کو اس مضمون کے بارے لکھا کہ خدارا ایسی غلطی نہ کریں، بجائے متعدد علمائے ظاہر کے ایک مخلص اور بے لوث عالمِ ربّانی کا انتخاب کریں۔ شیخ فرید کے نام مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

> "سنا گیا ہے کہ بادشاہِ اسلام نے اپنے حسنِ فطرت اور اسلامیّت کی بنا پر جو اس کی طبیعت میں ودیعت کی گئی ہے آپ سے فرمایا ہے کہ

چار علما سے دین کی خدمات حاصل کریں جو دربار میں رہیں اور مسائلِ شرعیہ کو بیان کریں، تاکہ بادشاہ کا کوئی حکم یا عمل خلافِ شرع واقع نہ ہو الحمد للہ سبحانہ لہ علی ذلک "مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر کیا خوشخبری ہو سکتی ہے۔ صاحب الغرض مجنون عرض کرتا ہے کہ ایسے علما دیندار بہت تھوڑے ہیں جو حبِّ جاہ وریاست سے خالی ہوں، اور شریعت کی ترویج اور ملّت کی تائید کے سوا اور کچھ مطلب نہ رکھتے ہوں۔ ایسی صورت میں ہر ایک عالم اپنی بزرگی جتا کر بادشاہِ وقت کے درمیان اختلافی باتیں لاکر اپنے قرب کا وسیلہ ڈھونڈے گا اور معاملہ بگڑ جائے گا۔ گذشتہ زمانہ میں بھی ایسے ہی علما سونے جہان کو مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اب اگر بادشاہِ وقت کو پھر صحبتِ علما درکار ہے تو علمائے آخرت میں سے کسی ایک عالم کا چناؤ کریں، یہی سعادت ہے اور یہی اکسیر ہے، جس طرح مخلوق کی خلاصی علما کے وجود پر وابستہ ہے جہان کا خسارہ بھی انھیں پر منحصر ہے۔ علما میں سے بہتر عالم تمام جہانوں کے انسانوں میں سے بہتر ہے اور علما میں بدتر عالم تمام جہان کے انسانوں میں بدتر ہے کیوں کہ تمام جہان کی ہدایت و گمراہی انھی پر موقوف ہے۔ کسی بزرگ نے ابلیس لعین کو خواب میں دیکھا کہ فارغ اور بیکار بیٹھا ہے اس کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ اس وقت کے علما میرا کام کر رہے ہیں بہکانے اور گمراہ کرنے میں وہی کافی ہیں۔ امید ہے کہ علما کے انتخاب میں صحیح غور وفکر سے کام لیں گے کیوں کہ جب کام ہاتھ سے نکل جائے تو کچھ علاج نہیں ہو سکتا۔ پس ایک ہی عالم آخرت کا چناؤ کریں۔"(15)

سطورِ بالا میں جو تفصیل بیان کی گئی اس کا تعلّق حضرت مجدّدؒ کی بالواسطہ کوششوں سے تھا، یعنی انھوں نے امرائے کبار اور ارکانِ سلطنت کو دین کی نصرت و حمایت، بادشاہ کو احترامِ دین و شریعت اور اصلاحِ حال پر اپنے مکاتیب کے ذریعہ حکومت کا رخ بدلنے میں بنیادی و مرکزی کردار ادا کیا۔ لیکن ابھی فرمانروائے سلطنت جہانگیر کے مزاج و

طبیعت میں وہ تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی جس کی اس عظیم الشّان اور دشوار کام کے لیے ضرورت تھی۔ شخصی و موروثی سلطنتوں میں بادشاہ کی ذات وہ مرکزی نقطہ ہوتی ہے جس کے گرد حکومت کا سارا نظام گردش کرتا ہے اس کا کسی بات کے لیے ارادہ کر لینا اور اس کے ذہن کا کسی امر کو قبول کر لینا خدا کے کسی مخلص اور بے لوث بندے سے اس کے دل میں عقیدت و محبّت کا پیدا ہو جانا اور اس کے اخلاص پر اعتماد کر لینا ہزاروں میل کے فاصلہ کو گھنٹوں اور منٹوں میں طے کر دیتا ہے اور بعض اوقات بظاہر ناممکن العمل چیز کو نہ صرف ممکن بلکہ واقعہ بنا دیتا ہے۔ جہانگیر اب تک حضرت مجدّدؒ کے روحانی و علمی مقام سے نا آشنا تھا، آپؒ ان اہلِ علم اور اہلِ تصوّف میں سے نہیں تھے جو درباروں میں آتے جاتے ہیں۔ بظاہر ایسی کوئی صورت نہ تھی کہ جہانگیر کو براہِ راست حضرت سے واسطہ پڑے اور وہ کسی حد تک ہی سہی، ان کے علمی اور روحانی مقام و مرتبہ سے واقف ہو سکے۔ حکمتِ الٰہی نے اس کا بھی عجیب و غریب طریقہ پر انتظام کیا۔ ایک وقتی غلط فہمی کے نتیجے میں جب جہانگیر نے آپؒ کو گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا اور پھر بعد ازاں اپنی غلطی پر شرمندہ ہو کر آپؒ کو نہ صرف پورے احترام سے رہا کیا، اور آپؒ کو اختیار دیا کہ چاہیں تو لشکرِ شاہی میں قیام فرمائیں یا پھر جہاں چاہیں تشریف لے جائیں۔ حضرت مجدّدؒ نے اصلاحِ احوال کے لیے اس موقع کو غنیمت جانا اور تین سال تک لشکرِ شاہی میں قیام پذیر رہے۔ آپؒ کی مجاہدانہ تبلیغ اس دوران پورے عروج پر رہی۔ رہائی کے بعد آپؒ بادشاہ جہانگیر کے دربار میں عزت و احترام سے تشریف لے جاتے اور روزانہ بعد از نمازِ مغرب بادشاہ سے خاص صحبت رہتی ہے۔ صاحبزادگان کے نام ایک مکتوب میں بادشاہ کے ساتھ ایک صحبت کا اس طرح ذکر فرماتے ہیں:

> "یہاں کے حالات بہت اچھے اور شکر کے قابل ہیں عجیب و غریب صحبتیں ہو رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان ساری گفت گوؤں میں دینی امور اور اسلامی اصول کے متعلق بال برابر کسی قسم کی نرمی یا سستی کا اظہار نہیں ہوا، وہی باتیں جو خاص مجلسوں اور خلوتوں میں بیان کی جاتی ہیں، ان معرکوں میں حق تعالیٰ کی توفیق سے بیان ہو رہی ہیں، اگر میں ایک مجلس کا بھی حال

لکھوں تو اس کے لیے ایک دفتر چاہیے خصوصاً آج کی رات جو رمضان کی 17 تاریخ ہے، پیغمبروں کی بعثت، عقل کی بیچارگی، آخرت، عذاب و ثواب پر ایمان لانے، حق تعالیٰ کے دیدار، خاتم الرّسل کی ختمِ نبوّت اور ہر صدی کے مجدّد اور خلفائے راشدین کی پیروی اور تراویح کے مسنون ہونے، تناسخ کے باطل ہونے، جنّات کے ذکر، ان کے عذاب و ثواب کے مسئلے اور اس قسم کی بہت سی باتوں کا ذکر رہا (بادشاہ نے) پوری توجہ سے سنا اس سلسلے میں اقطاب وابدال واوتاد اور ان کی خصوصیتوں کا بھی ذکر آیا، خداوند تعالیٰ کا شکر ہے کہ (بادشاہ) ایک حال پر قائم رہے ان میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا، شاید ان واقعات اور ملاقاتوں میں حق تعالیٰ کی مصلحتیں اور اسرار پوشیدہ ہوں، شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس بات کی ہدایت فرمائی۔"(16)

اس مکتوب گرامی سے اندازہ ہوتا ہے کہ قلعہ گوالیار میں نظر بندی اور پھر بادشاہ کی رفاقت نے حضرت مجدّدؒ کو مجلسِ شاہی میں حق کہنے سے باز نہ رکھا، بلکہ بے باک بنا دیا ایک ایسے جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا جو ظلم کر چکا ہو، بلکہ جس کی ستم رانیوں کا سلسلہ جاری ہو، واقعی افضل جہاد ہے۔ حضرت مجدّدؒ نے بادشاہ کے سامنے جن مسائل کو بیان فرمایا یہ وہی مسائل تھے جو دورِ اکبری میں ایسے الجھ گئے تھے کہ سلجھائے نہ سلجھ سکے، اور اس الجھن نے پوری فضا اور ماحول کو الجھا دیا تھا، مجلسِ شاہی میں ان مسائل کا ذکر خود اس بات کی دلیل ہے کہ گمراہ کن افکار و نظریات کی بنیادیں ہل چکی تھیں، اور آپؒ کے علمی اور روحانی اثرات بادشاہ، دربار اور پورے ماحول کو اپنے حصار میں لے چکے تھے۔ حضرت مجدّدؒ ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہانگیر کی وفات کے بعد ماحول میں مزید بہتری آتی چلی گئی۔

مغل حکمران شاہجہان (1627 - 1657ء) کے بعد حصولِ اقتدار کے لیے داراشکوہ (1615- 1657ء) اور اورنگزیب عالمگیر (1657-1707ء) کے درمیان برپا ہونے والی معرکہ آرائیوں کو عام طور پر دو شہزادوں کی جنگ سمجھا جاتا ہے لیکن درحقیقت یہ دو نظریات کی جنگ تھی ایک طرف جلال الدین محمد اکبر کے خود ساختہ دین الٰہی کی

حمایت میں تصوّف، صلحِ کل، مذہبی رواداری اور انسان دوستی کے عنوان سے مسلمانوں کے دینی تشخص کو ہندی معاشرہ میں تحلیل کر دینے کی مہم تھی، جس کی قیادت وحدۃ الوجود کے تصوّر کی بعض گمراہ کن تعبیرات کے زیر اثر داراشکوہ کے ہاتھ میں تھی اور دوسری طرف مسلم تشخّص اور امتیاز کو برقرار رکھتے ہوئے معاشرتی اصلاح اور نظام ریاست و حکومت کو اسلامی اصول پر کھڑا کرنے کا عزم تھا، جس کا عَلم اورنگزیب عالمگیر نے اٹھا رکھا تھا۔ عالمگیر نقشبندی سلسلے میں حضرت مجددؒ کے صاحبزادے خواجہ محمد معصومؒ (1009-1079ھ) سے بیعت ہونے کے ساتھ مجدّدی نظریات سے بھی شدید طور پر متاثر تھا۔ داراشکوہ کی شکست سے مغل دربار میں حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی فکر نے فیصلہ کن غلبہ حاصل کر لیا، اور نظامِ حکومت و ریاست کو اسلامی اصولوں پر استوار کرنے کی راہ ہموار ہو گئی۔

اصلاحِ احوال کے لیے خدمتِ خلق کا اصول:

قیامِ پاکستان سے لے کر تادمِ تحریر پاکستان میں مختلف دینی جماعتوں نے مختلف اوقات میں ہونے والے جنرل الیکشنز میں ہمیشہ بھرپور حصّہ لیا ہے، اور پاکستانی دینی سیاسی جماعتوں کی کامیابی کا تناسب بھی تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ایک جیسا رہا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مختلف مواقع پر ہونے معتبر بین الاقوامی اداروں اور ایجنسیز کے جائزے (Surveys) کے مطابق پاکستان کی نوے فیصد (90٪) عوام ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ چاہتے ہیں، لیکن اس باوجود پاکستان میں دینی سیاسی جماعتیں جس انجام سے دو چار ہیں اگر اس کے اسباب کی کھوج لگائیں تو واضح ہوگا کہ عام طور پر یہ جماعتیں جن ایشوز (issues) کی بنا پر سیاست کرتی ہیں وہ زیادہ تر مابعد الطبیعیاتی (Meta-physics) نوعیت کے ہیں اور ان کا لوگوں کے زندہ مسائل، معروضی حالات اور مستقبل کی امنگوں سے کم ہی تعلق ہوتا ہے، بالفرض اگر وہ مسائل حل ہو جائیں تو اس کے بعد وہ دینی جماعتیں ایشولیس (issueless) ہونے کی وجہ سے غیر مؤثر ہو جاتی ہیں، اس تناظر میں دینی جماعتوں کو چاہیے کہ وہ اپنی افادیت ثابت کرنے کے لیے معاشرے کے بنیادی انسانی حقوق اور دیگر زندہ مسائل کو اپنے طرزِ سیاست کی بنیاد بنائیں۔ یہ بات یاد رکھنے والی ہے کہ عملی سیاست میں کوئی

مخدوم نہیں ہوتا اسی لیے اسلام نے "سید القوم خادمھم" کہ قوم کا سردار ان کا خادم ہے، کا ابدی اصول اور تصوّر دیا ہے۔ اسلامی طرزِ سیاست میں لوگوں کے مسائل کو حل کرنا اوّلین ترجیح ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہجرتِ مدینہ کے فوراً بعد مہاجرین اور انصار کے درمیان مؤاخات کا رشتہ قائم کر کے ان کے معاشی، معاشرتی اور دیگر مسائل کو حل فرمایا۔ سیرت نگاروں نے تو مؤاخاتِ مدینہ سے بھی پہلے "مکی مؤاخات" کا ذکر کیا ہے۔ مکی اور مدنی مؤاخات کا بنیادی مقصد امدادِ باہمی اور ظلم سے تحفّظ تھا، گویا مسلمانوں کے اس آپسی تعلّق کی بنیاد صرف عقیدہ نہیں تھا بلکہ رشتہ مؤاخات کا ایک اہم مقصد لوگوں کے معاشی مسائل کا حل بھی تھا۔ نظمِ ریاست کے استحکام کے لیے بنیادی انسانی حقوق بالخصوص لوگوں کے معاشی حقوق کا تحفظ لازم ہے۔ حضرت مجددؒ کو عوامی سطح پر جو قبولیت حاصل تھی اس کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ آپؒ لوگوں کی روحانی تربیت کرنے کے ساتھ ان کی معاشی ضروریات کا مدوا کرنے کی کوشش بھی فرماتے تھے۔ حضرت مجددؒ اپنی ذاتی حیثیت میں لوگوں کی مدد کرنے کے علاوہ اراکینِ سلطنت، امرا اور سرکردہ افراد کو بھی ضرورت مندوں کی مدد پر ابھارتے اور ان کی حوصلہ افزائی فرماتے۔

حضرت مجدّدؒ نے اپنے مکتوبات میں خدمتِ خلق کے مختلف پہلوؤں پر زور دیا ہے۔ ایسے مکتوبات جن میں آپؒ نے کسی ضرورت مند کی مدد کی نصیحت کی یا خدمتِ خلق کی اہمیت بیان کی ان تعداد دفتر اوّل میں تقریباً اٹھائیس، دفتر دوم میں چار اور سوم میں دو ہے۔ جن شخصیات کو آپؒ نے خدمتِ خلق پر ابھارنے کے لیے خطوط صادر فرمائے ان میں خواجہ جہاں، شیخ درویش، شیخ فرید بخاری، شیخ عبد الوہاب بخاری، شیخ محمد یوسف، خانِ خاناں، قلیچ خان، جباری خان، میر فتح اللہ حکیم، سید احمد قادری، ضلع جرک کا ایک حاکم، محمد شریف، میاں سید احمد بجواری، شیخ حمید سنبھلی، مرزا مظفر، منصور عرب، صدر جہاں، مرزا داراب، ملا طاہر لاہوری، مولانا حسن برکی، مرزا اعراب خان، خان جہاں، خواجہ شرف الدین وغیرہ شامل ہیں۔ ان مکاتیب میں آپؒ نے مخلوق سے محبّت اور ان کے دکھ درد دور کرنے کے لیے جس سوز و درد کا مظاہرہ کیا ہے وہ آپ ہی کا خاصہ ہے۔ اس نوعیت کے چند مکتوب ملاحظہ فرمائیں۔

ملازمت کی سفارش کے لیے لکھے گئے مکتوبات:

جباری خاں (1021ھ) کے نام: " دوسری عرض یہ ہے کہ اس رقعہ دعا کا حامل شیخ مصطفیٰ قاضی شریح کی نسل سے ہے۔ ہندوستان میں ان کے بزرگ، بزرگوں کی حیثیت سے تشریف لائے ان کے بزرگوں کے گزر و بسر کے ذرائع اور بہت سے وظائف مقرر تھے۔ شیخ مصطفیٰ بے روزگاری کے سبب فوج کی ملازمت کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور اپنی اسناد اور متعلقہ احکام اپنے ہمراہ لائے ہیں، انھیں امید ہے کہ آپ کے توسّل سے ان کو دل جمعی اور سکون نصیب ہوگا۔ شخص مذکور کے لیے بڑے آفیسروں کی خدمت میں اس طرح سفارش فرمائیں کہ مؤثر ثابت ہو اور معاشی پریشانیوں کے ستائے ہوئے افراد کے لیے دلی سکون کا سبب ہو۔"(17)

> "یہ چند حروف رابطہ محبّت و اخلاص کی بنا پر لکھے گئے ہیں۔ اُمید ہے کہ ملال کا باعث نہیں بنیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ملا عمر اور شاہ حسن شریف زادے ہیں۔ ملازمت و نوکری کے طلب گار ہیں۔ امید ہے کہ انھیں اپنے خاص ملازمین میں داخل کر لیں گے۔ اسماعیل بھی یہی ارادہ لے کر حاضر خدمت ہوا ہے۔ اگرچہ پیادہ ہے مگر امید رکھتا ہے کہ اپنے حال کے مطابق ضرور حصّہ پائے گا۔"(18)

سید احمد بجواری کے نام: موصوف کو ایک ضرورت مند کو نوکری پر لگوانے کے لیے مکتوب صادر کیا۔ رقمطراز ہیں:

> "بات یہ ہے کہ میاں شاہ عبد اللہ ولد میاں شیخ عبد الرحیم ان فقرا (مجدّد صاحبؒ اور ان کا خاندان) کے ساتھ تعلّقِ قرابت رکھتا ہے۔ ان کے والد مدت تک بہادر خاں کے ملازم رہے ہیں اور صاحبِ مرتبہ، اب نابینا ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے لڑکے کو بھیجا ہے کہ بہادر خاں کے پاس جا کر ملازمت کرے، اس بارے میں اگر آپ کی طرف سے بھی کچھ اشارہ ہو جائے تو فائدہ مند رہے گا۔"(19)

ایک دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں:

> " ایک دوسری تکلیف آپ کو یہ دی جاتی ہے کہ میاں شیخ عبد الفتاّح حافظ ذِی عزت لوگوں میں سے اور آدمی زادہ ہیں، کثیر العیال اور

بہت سی لڑکیوں کے باپ ہیں۔ اسبابِ معاش کی قلّت نے ان کو اس امر پر مجبور کیا ہے کہ کریم اور کئی لوگوں کے آستانے تک پہنچیں۔ امید ہے کہ ان کا مقصود پورا ہو گا۔"(20)

ضرورت مندوں کی سفارش کے لیے لکھے گئے مکتوبات:

مرزا اعراب خان کے نام: صاحبِ موصوف کو مخلوقِ خدا سے حسنِ سلوک کی طرف متوجّہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے اور مخلوق میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو وہ پیارا ہے جو اس کے عیال سے اچھا سلوک کرے۔ حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ مخلوق کے رزق کا کفیل ہے۔ پس مخلوق اس کے عیال کی طرح ہے جو آدمی کسی کے عیال سے غمخواری کرے اور اس کے بوجھ کو برداشت کرے تو یہ شخص اس عیال والے کا محبوب ہو جائے گا، کیوں کہ اس نے اس کا بوجھ ہلکا کر دیا اور اس کی مشقّت کو اپنے اوپر ڈال لیا، اس بنا پر تکلیف دینے کی جرات کرتا ہوں کہ حافظ احمد نیک آدمی اور قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے ہیں۔ بال بچوں کی کثرت نے ان کو پریشان کر رکھا ہے، وہ ان کی ذِمّہ داری سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔ آپ کے کرم سے درخواست ہے کہ ان کی امداد و اعانت کریں۔ سخی لوگوں کو سخاوت کے لیے بہانہ کافی ہے۔(21)

اس مکتوب میں حضرت مجدّدؒ نے بڑے ہی نادر اسلوب میں خدمتِ خلق اور انسانی ہمدردی کے مقدّس جذبہ پر ابھارا ہے کہ اگر کوئی شخص دنیا میں کسی کے اہل و عیال کے ساتھ غم خواری کرتا ہے، ان کی کفالت کرتا ہے اور ان کا بوجھ اپنے شانوں پر لے لیتا ہے تو یہ شخص اس صاحبِ عیال کا محبوب بن جاتا ہے، تو اس رحمان و رحیم کے بارے میں غور کرنا چاہیے، پوری مخلوق جس کا کنبہ ہے اور وہی تمام مخلوق کے رزق کا کفیل بھی ہے، اگر کوئی اس ذاتِ باری تعالیٰ کے کنبہ کی کفالت کرے، ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرے اور ان کے لیے کشادہ دلی سے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دے تو کیا وہ شخص اس ربِ دوجہاں کا محبوب نہیں بنے گا، لہٰذا اس کی محبوبی کے طالب اور اس کی خوشنودی کو حاصل کرنے والے افراد کو چاہیے کہ اس کی مخلوق کے ساتھ مواسات و ہمدردی کا سلوک کریں، اسی میں اس کی محبوبیت کا راز پنہاں ہے۔

خانِ خاناںؒ کے نام: حضرت مجدّدؒ، خانِ خاناںؒ کے نام اپنے ایک مکتوب میں ایک ضرورت مند کی سفارش کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"سیادت مآب سید ابراہیم آپ کے بلند آستانہ سے قدیمی تعلّق و نسبت رکھتا ہے اور آپ کے دعاگوؤں میں شامل ہے۔ آپ کے ذِمّۂ کرم پر لازم ہے کہ اس کی دست گیری فرمائیں تاکہ اس فقر اور بڑھاپے کے وقت اپنے اہل وعیال میں فراغت اور سکون سے اپنا وقت گزاریں اور آپ کے دونوں جہان کی سلامتی کی دعا میں مشغول رہیں۔"(22)

حضرت مجدّدؒ اپنے ایک مکتوب میں خانِ خاناں کے ساتھ اپنی محبّت کا اظہار کرنے کے بعد حاجت مند کی سفارش بایں الفاظ فرماتے ہیں:

"دو ضروری اور اہم کام بے اختیار آپ کو تکلیف دینے کا باعث بنے ہیں۔ ایک رنج و آزار کا گمان رفع کرنے کا اظہار، بلکہ آپ سے محبّت اور اخلاص کا ہونا۔ اور دوسرا ایک محتاج آدمی کی طرف اشارہ جو فضیلت اور نیکی سے آراستہ ہے اور معرفت اور شہود سے مزیّن ہے، جو نسب کے لحاظ سے کریم اور حسب کے اعتبار سے شریف ہے۔"(23)

خانِ خاناں ہی کے نام حضرت مجدّدؒ ایک دوسرے مکتوب میں رقمطراز ہیں:

"میاں شیخ عبد المومن بزرگ زادہ ہیں اور تحصیلِ علم سے فارغ ہو کر طریقۂ صوفیہ کا سلوک فرماتے ہیں، اور سلوک کے ضمن میں عجیب وغریب احوال مشاہدہ کرتے ہیں۔ ضروریاتِ انسانی از قسم اہل وعیال ان کو حیران و بے اختیار ناچار کر دیتی ہیں۔ اس فقیر نے ناچارگی اور پریشانی کو دور کرنے کے لیے آپ جناب کی طرف ان کی راہنمائی کی ہے۔ "من دق باب الکریم انفتح" جس نے کریم کا دروازہ کھٹکھٹایا وہ کشادہ حال ہو گیا۔"(24)

خواجہ جہاں کے نام: موصوف کو ایک ضعیف شخص کی مالی امداد کی سفارش کرتے ہوئے حضت مجدّدؒ لکھتے ہیں:

"گزارش ہے کہ میاں شیخ زکریّا جو پہلے عہدہ تحصیلداری پر فائز تھا آج کل محبوس اور بند ہے۔ شومئ اعمال کے باعث مدّت سے قید خانہ

میں بند ہے۔ ضعفِ پیری، تنگیٔ معاش اور قید خانہ میں عرصہ سے پڑا رہنے کی وجہ سے بالکل تنگ اور پریشان ہے۔ اس نے مجھے لکھا تھا کہ لشکر میں آکر میری رہائی کی کوشش کریں۔ راستے کی لمبی مسافت وہاں تک آنے میں مانع ہوئی۔ برادرِ عزیز خواجہ محمد صادق آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہے تھے۔ ضرورت کے ان چند کلمات کی تکلیف دی ہے۔ امید ہے کہ اس بوڑھے اور ضعیف شخص کے بارہ میں توجہ عالی کریں گے۔ کیوں کہ وہ عالم بھی ہے اور اسے ضعفِ پیری بھی لاحق ہے۔"(25)

حضرت مجدّدؒ نے ایک مکتوب میں پہلے خواجہ جہاں سے محبّت کا اظہار کرتے ہوئے چار دعاؤں سے نوازا، اللہ تعالیٰ تمہارے دل کو سلامتی عطا کرے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سینہ کشادہ کرے۔ تمہارے نفس کو پاکیزگی عطا کرے۔ آپ کے جسم کو ملائم و نرم کرے۔ اور پھر حضرت مجدّدؒ نے شیخ سُلطان مرحوم کے دونوں بیٹوں کی معاشی پریشانی کا ذکر فرما کر خواجہ جہاں کو اُن کی مالی اعانت کے لیے سفارش فرمائی کہ مرحوم شیخ سلطان کے دونوں بیٹے پریشانی اور معاشی تنگی میں مبتلا ہیں، آپ سے التماس ہے کہ ان کی مدد و اعانت فرمائیں۔ ان کی امداد آپ کے شایانِ شان ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام لوگوں کی حاجت برآری کی توفیق بخشی ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی توفیق میں مزید اضافہ کرے، اور خیر و بھلائی کو آپ کا رفیق و ساتھی بنائے۔"۔(26)

شیخ عبدالوہاب بخاری کے نام: موصوف کو ایک سید بزرگ کی مالی امداد کی سفارش کرنے کے لیے پہلے اہل بیت کی فضیلت بیان کرتے ہیں اور پھر لکھتے ہیں:

"اس عرضی نیاز کا حامل میر سید احمد سادات میں سے ہیں طالبِ علم اور صالح شخص ہیں، معاش کی تنگی کے باعث آپ کی جانب متوجہ ہوئے ہیں۔ آپ کی بلند سرکار میں کچھ گنجائش ہو تو موصوف مذکور اس کے لائق و مستحق ہیں ورنہ اپنے مخلصوں میں سے کسی کی طرف ان کی سفارش فرمائیں، تاکہ تنگیٔ معاش کی طرف سے مطمئن ہو جائیں چون کہ یقین تھا کہ خود آنجناب فقرا اور محتاجوں کے بارے میں اور

خصوصاً ساداتِ عظّام کی امداد کے بارے میں پوری توجہ فرماتے ہیں اس لیے یہ چند کلمات لکھنے کی جرات کی گئی ہے۔"(27)

محمد شریف کے نام: محمد شریف کو ایک لمبا مکتوب لکھا اور آخر میں دعا (حق سبحانہ و تعالیٰ بحرمت حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اپنے پسندیدہ کاموں کی توفیق نصیب کرے) دینے کے بعد کہتے ہے:"دوسری مقصودی بات یہ ہے کہ مولانا اسحاق فقیر کا آشنا اور مخلص ہے اور قدیم زمانہ سے ہمائیگی کا حق بھی رکھتا ہے۔ اگر آپ سے مدد و اعانت طلب کرے تو اس کی طرف خصوصی توجہ فرمائیں۔ موصوف فنِّ کتابت و انشاء سے بھی بقدر ضرورت واقفیت رکھتا ہے۔"(28)

خان جہاں کے نام: خان جہاں کو دعائیہ کلمات کہنے کے بعد لکھتے ہے:" دعائیہ رقعہ لے جانے والے فضائل مآب خواجہ محمد سعید و خواجہ محمد اشرف اپنے مخصوص دوستوں سے ہیں جس قدر بھی آپ اُن کے احوال کی رعایت کریں گے فقیروں پر احسان کا باعث ہوگا۔ آپ کا معاملہ بہت بلند ہے اور آپ کی شان بہت رفیع ہے۔"(29)

خواجہ شرف الدین حسین کے نام: صاحب موصوف کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں :"فقرا اور مساکین اور کمزوروں کی ایک جماعت آپ کی رعایت اور حمایت سے آسودہ حال ہے۔ چون کہ یہ بھی اپنا ایک مالک رکھتے ہیں اور وہ ان کو کافی ہے، البتہ آپ کی نیک نامی باقی رہ گئی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ آپ کو اس کی جزا دنیا اور آخرت میں عطا کرے۔"(30)

قرض دار کی مدد کے لیے مکتوبات:

ضلع جرک کے ایک حاکم کے نام: حضرت مجدّدؒ ضلع جرک کے حاکم کو اس کے ساتھ اپنی ایک گذشتہ ملاقات کا حوالہ دیتے ہو لکھتے ہیں:

"آپ نے ملاقات کے وقت از روئے کرم نوازی فرمایا تھا کہ اگر کسی مہم اور کام میں رجوع کی ضرورت پڑے تو ہمیں لکھنا اس بنا پر بندہ ایک تکلیف دیتا ہے کہ شیخ عبداللہ صوفی نیک لوگوں میں سے ہیں بعض ضروریات کی وجہ سے قرض دار ہو چکے ہیں، امید ہے کہ اسے قرض سے نجات دلانے میں مدد فرمائیں گے۔"(31)

حضرت مجددؒ کے مندرجہ بالا تمام مکتوبات سے جو نکات نکھر کر سامنے آتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ ایک داعی اپنے مشن میں اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب اس کی کوششیں اخلاص سے معمور ہوں اور یہ کہ دنیوی فوائد سے بے رغبتی داعی کے پیغام کو طبقۂ امرا میں مقبول بنا دیتی ہے۔ نیز حضرت مجددؒ کے زیر نظر خطوط سے یہ چیز بھی سامنے آتی ہے کہ ایک داعی کا صرف یہی کام نہیں کہ وہ لوگوں کی روحانی ترقی پر نظر رکھے، بلکہ اسے لوگوں کے دکھ درد میں بھی شریک ہونا چاہیے اور ان کے ساتھ اس طرح گھل مل کر رہنا چاہیے کہ ان کے سماجی مسائل اس کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ اگر وہ لوگوں کی براہِ راست مدد کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو تو اصحابِ خیر کو ان کے مسائل کی طرف متوجہ کرے۔ اس انداز سے وہ لوگوں کے دل میں جگہ بنا سکتا ہے اور آسانی کے ساتھ دلوں کی زمین کو دعوت کے بیج کی تخم ریزی کے لیے ہموار کر سکتا ہے، اور لوگوں کے اندر اس کی مقبولیت اربابِ بست و کشاد کو بھی اس کی طرف متوجہ کر سکتی ہے اور اس بنیاد پر اس کے لیے اہلِ اقتدار کی اصلاح کا موقع پیدا ہو سکتا ہے۔

خدمتِ خلق کرنے والوں کی تربیت اور حوصلہ افزائی:

حضرت مجددؒ اگر کسی کو فقرا کا ہمدرد اور غمگسار پاتے تو اس کی مدح سرائی بھی کرتے اور حوصلہ افزائی بھی۔ مرزا بدیع الزّماں کی طرف ارسال کردہ خط میں لکھتے ہیں: "آپ کا مکتوب شریف و مراسلہ لطیف صادر ہوا، الحمد للہ مضمون سے فقرا کی محبّت اور درویشوں کی طرف توجہ معلوم ہوتی ہے جو کہ سعادتوں کا سرمایہ ہے کیوں کہ یہ لوگ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہم نشین ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جن کا وجود بدنصیب نہیں ہوتا۔"(32)

میرزا عبد الرحیم خانِ خاناںؒ صاحبِ ثروت اور سلطنت مغلیہ کے رکنِ رکین ہونے کے ساتھ اہل اللہ اور درویشوں کے خدمت گاروں میں تھے، مگر ان کے اندازِ تحریر سے تحکم اور تکبر کی بو آتی تھی۔ حضرت مجددؒ ایک مکتوب میں خانِ خاناں کو تواضع اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "یہ ٹھیک ہے کہ آپ نے فقرا کی بہت خدمت کی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی فقرا کے آداب کا لحاظ بھی بہت ضروری ہے، تاکہ اس پر ثمرہ اور نتیجہ بر آمد ہو۔ اور اس کے بغیر تو خار دار درخت پر ہاتھ پھیرنے والی بات ہے، یعنی کچھ فائدہ نہیں ہے۔ ہاں حضور ﷺ کی امت کے متقی لوگ تکلّف سے بری ہیں اور متکبروں کے ساتھ

تکبر کرنا بھی ایک قسم کا صدقہ اور نیکی ہے۔ حضرت خواجہ نقشبندؒ کو ایک شخص نے متکبر کہا تو انھوں نے فرمایا: میرا تکبر خدا کے لیے ہے۔ اس گروہِ فقرا کو ذلیل خیال نہ کریں، کیونکہ حدیث نبوی ہے: "رُبَّ اَشْعَثَ مَدْفُوعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّہٗ" (بہت سے پراگندہ بال، گرد آلود، دروازوں سے دھکیلے جانے والے (باطن میں ایسا بلند مقام رکھتے ہیں) کہ اگر اللہ کی قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ ضرور ان کی قسم پوری کرتا ہے۔) اگرچہ یہ باتیں تلخ معلوم ہوتی ہیں، لیکن آپ کی خوشامد اور چاپلوسی کرنے والے بہت ہیں، آپ اسی پر اکتفا کریں۔ فقرا سے آشنائی اور ملاقات سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے پوشیدہ عیوب اور مخفی کمینی حرکات سے واقف اور مطلع ہو۔ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ اس طرح کی باتوں سے آزار اور تکلیف دینا مقصود نہیں، بلکہ یہ باتیں خیر خواہی اور دلسوزی کے طور پر ہیں۔"(33)

تکبر در اصل ایک روحانی اور اخلاقی مرض ہے جس کا علاج تواضع اور انکساری ہی سے ممکن ہے۔ تواضع، غربا کا اظہارِ حال اور امرا کے لیے باعثِ کمال ہے۔ مذکورہ مکتوبات پڑھنے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ مستقل طور پر اپنے مریدین کو خدمتِ خلق کو انجام دینے اور فقرا و مساکین کے ساتھ غم خواری اور ان کی طرف خاص توجہ مرکوز کرنے کا حکم صادر فرماتے جس کو مریدین بسر و چشم قبول کرکے اپنے اپنے علاقوں و حلقوں میں خدمتِ خلق کی خوبصورت کہکشاں بھی سجاتے مزید برآں وہ اپنے شیخ و مرشد کو اپنے احوال لکھنے کے دوران فقرا کی طرف توجہ اور ان کے ساتھ ہمدردی کی اپنی کیفیات بھی تحریر کرتے، جس کے بعد حضرت مجددؒ ان کے اس عمل کی تحسین بھی فرماتے اور قلبی مسرت کا اظہار بھی فرماتے کیوں کہ یہ ایسا شعبہ ہے جس کو زندہ کرنے کے بعد انسانوں سے روابط میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔

دورِ حاضر میں داعیانِ اسلام کی دعوت کے غیر مؤثر ہونے کی ایک بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ ان کا افرادِ معاشرہ کے ساتھ براہِ راست تعلق نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہمارے ہاں طبقۂ عوام کے مسائل سے آگاہی حاصل کرنا اور پھر ان کے حل کی عملی کوشش، دعوتِ دین کے دائرہ سے باہر سمجھی جا رہی ہے۔ یہ طرزِ عمل رسول اللہ ﷺ کے منہاجِ دعوت سے بہت بڑا انحراف ہے۔ اس وقت عیسائی مبلّغین پوری دنیا میں خدمتِ خلق کے نام پر اپنے باطل نظریات کے پرچار میں مصروف ہیں۔ غور کیا جائے تو برِّ صغیر میں صوفیہ

کرامؒ نے بلا امتیازِ رنگ و نسل و مذہب لوگوں کی خدمت کو اپنا شعار بنایا اور لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے میں کامیاب ٹھہرے۔ خانقاہی نظام میں لنگر کا تصوّر اس اسلوبِ دعوت کی خوبصورت مثال ہے۔ حضرت مجددؒ کے دعوتی منہج میں بھی اس اسلوب کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ نہ صرف ذاتی حیثیت میں آپ نے مخلوقِ خدا کی خدمت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا، بلکہ اصحابِ ثروت کو بھی اس طرف توجہ دلائی۔ سطور بالا میں صرف چند مثالیں پیش کی گئی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ایک طرف اگر شیخِ مجددؒ کی اپنے ارادت مندوں کی روحانی ترقی پر گہری نظر تھی تو دوسری طرف وہ ان کے روز مرہ زندگی کے مسائل سے بھی پوری آگہی رکھتے تھے۔

اس ساری گفت گو کا حاصل یہ ہے کہ مقتدر حلقوں کو لوگوں کی ضروریات کی طرف متوجہ کرنے کی وجہ سے اور عام لوگوں کے لیے ایک موثر وسیلہ بننے کی وجہ سے حضرت مجددؒ کا تمام رعایا کے ساتھ گہرا قلبی رشتہ اور تعلّق قائم ہو چکا تھا۔ رعایا میں آپؒ کی اس مقبولیت کی وجہ سے حکومتِ وقت کے لیے آپؒ کی رائے کو یکثر نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ عوام النّاس میں آپ کو جو اثر و رسوخ حاصل تھا اسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آپؒ نے نظامِ ریاست اور امورِ مملکت کی اصلاح فرمائی۔ حضرت مجددؒ کا یہ طرزِ عمل بھی مذہبی راہنماؤں کے قابلِ توجہ کہ انھوں نے اپنے مریدوں اور میزبانوں کی طرف سے ملنے والے تحائف اور ہدایا کو "غیبی امداد "قرار دے کر اپنے ذاتی اثاثوں میں اضافہ نہیں کیا بلکہ اس نوعیت کے تحائف اور ہدایا کو لوگوں کی ضروریات پر صرف فرمایا اور جہاں ضروری سمجھا وہاں ارکانِ سلطنت اور صاحبِ حیثیت حضرات کو خط لکھ کر ضرورت مندوں کی طرف متوجہ کیا۔ دورِ حاضر میں وہ حضرات جو نظامِ ریاست و حکومت کو درست کرنا چاہتے ہیں، اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اقتدار کی خواہش کیے بغیر عوام میں اپنا اثر و رسوخ پیدا کریں، پھر وہ اسی کی مدد سے نظامِ ریاست و حکومت کو درست کر سکیں گے۔

3-عصری تحدّیات کے درست اِدراک سے اِصلاحِ احوال:

معاشرتی اصلاح اور نظامِ ریاست و حکومت کو اسلامی اصولوں پر استوار کرنے کے لیے ایک بالغ نظر مصلح اور داعی کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے دور کے فکری اور عملی چیلنجز سے پوری

طرح واقف ہو۔ کسی بھی فتنے کو فکری محاذ پر شکست دیئے بغیر معاشرے اور حکومتی نظم ونسق پر اس کے اثرات کو تادیر روکنا ممکن نہیں ہوتا۔ شیخ مجددؒ نے تجدید واحیائے دین کا جو عظیم الشان کام انجام دیا اس کی صحیح قدر وقیمت اس وقت واضح ہو سکتی ہے جب اس کے پس منظر اور ماحول کو سمجھا جائے جس میں یہ کارنامہ انجام دیا گیا ہے۔ حضرت مجدّدؒ نے تجدید واحیائے دین کا عظیم الشان کارنامہ جس دور میں انجام دیا، اگر ہم اس دور کا تنقیدی جائزہ لیں تو یہ افسوس ناک حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے۔ اسلام داخلی اور خارجی فتنوں کی زد میں تھا۔ داخلی فتنوں میں نام نہاد صوفیائے خام کی تعلیمات اسلامیانِ ہند کے لیے گمراہی کا سبب بن رہی تھیں، کچھ نام نہاد اہلِ تصوّف ہندو فلسفہ کو اسلام کے پیراہن میں پیش کر رہے تھے۔ عوام النّاس اور کم علم لوگ شریعت و طریقت کو دو متوازی دھارے سمجھ کر شدید گمراہی میں مبتلا ہو رہے تھے۔ شیخ مجدّدؒ سے پہلے کی پوری ایک صدی وحدۃ الوجودی صوفیہ کے عروج کی صدی کہی جا سکتی ہے، بعض صوفیائے خام نے "بدعتِ حسنہ" کے نام پر ہر طرف بدعاتِ ضلالہ کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ علمائے سو کا فتنہ بھی اپنے عروج پر تھا، نام نہاد علما نے محض اپنے علمی تفوّق، ذاتی مفادات اور بادشاہ کی نگاہ میں معتبر بننے اور اگلی صفوں میں کرسی حاصل کرنے کے لیے ایسی لایعنی بحثوں اور علمی موشگافیوں کا میدان سجایا جس کے نتیجے میں بادشاہ نہ صرف علما سے بدظن ہوا بلکہ اس کے دل میں اسلام کی حقانیت کے بارے میں ہی شکوک وشبہات پیدا ہو گئے۔

بادشاہ ہمایوں کی وجہ سے شیعہ مذہب ایران سے ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔ جہانگیر کا دورِ حکمرانی آیا تو جہانگیر کی بیوی ملکہ نور جہاں کی وجہ سے حکومت کی باگ ڈور ہی شیعہ کے ہاتھ میں چلی گئی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جہانگیر کے نام پر ملکہ نور جہاں کا شیعہ گھرانہ ہی اس وقت ہندوستان پر حکومت کر رہا تھا، نور جہاں کا باپ دیوانِ کل، اس کا بھائی آصف وکیلِ مطلق تھے، اس طرح حکومت پر عملاً اہلِ تشیع قابض ہو چکے تھے، عوام النّاس بادشاہوں کے دین پر ہی ہوتے ہیں، کے اصول کے مطابق طبعی طور پر عوام میں بھی شیعہ مذہب پھیل رہا تھا۔ اسلامیانِ ہند جو کہ عام طور پر اہلِ سنّت ہیں ان میں حبِ اہلِ بیت کے

نام پر حضرت علی المرتضی کی افضلیت کا عقیدہ اور دیگر صحابہ کرام سے بغض و دشمنی کی تبلیغ سرِعام ہونے لگی۔

اسلام کے پہلے ہزار سالہ دور کے خاتمے پر عالمِ اسلام اور خاص طور پر برِّ صغیر کی جو صورتِ حال تھی اس کے تاریخی مطالعہ کے بعد جو نقوش ابھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ بہت زلزلہ انگیز تھے۔ دسویں صدی ہجری کی فتنہ انگیز تحریکوں میں ذِکری تحریک کی بنیاد نبوت محمدی ﷺ کے الفِ اوّل پر اختتام اور الفِ ثانی کے لیے ایک نئی نبوّت اور ہدایت کے آغاز پر تھی۔ ایک اور تحریک جس نے اسلامیانِ ہند کو اس وقت سخت اضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا، وہ ہندوستان میں "فرقہ روشنائیہ" کا ظہور تھا۔ جس کا بانی بایزید المعروف "پیر روشن" (م 1525ء) بذاتِ خود نبوّت کا دعوٰی دار تھا۔ اپنے اثرات کے اعتبار سے اس عہد کی سب سے زلزلہ انگیز تحریک تحریکِ مہدویت تھی، جس کے بانی سید محمد (ابن یوسف جونپوری ولادت 847ھ) کی وفات اگرچہ دسویں صدی کی ابتدا یعنی 910ھ میں ہو گئی تھی لیکن اس کے اثرات دسویں صدی کے اخیر تک باقی رہے، تاریخ تنقیدی اور غیر جانب دارانہ مطالعہ کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ گذشتہ دو تین صدیوں میں کوئی دینی تحریک برِّ صغیر میں اتنے وسیع پیمانہ پر مسلمانوں پر اثر انداز نہیں ہوئی تھی جتنی کہ یہ تحریک اثر انداز ہوئی۔ سید محمد نے مہدی ہونے کا دعوی کیا۔

فلسفہ اور عقلی علوم کے شیدائی صلح کل کے نام پر وحدتِ ادیان کا راگ الاپ رہے تھے، اور یہ لوگ دین کا ایک ایسا ایڈیشن تیار کرنے کے چکر میں تھے جو تمام ادیان کا معجونِ مرکب ہو۔ اس سوچ کے اسلامیانِ ہند پر جو تہذیبی اثرات مرتب ہوئے اسی کی بنا پر ملا عبد القادر بدایونی (م 1605ء) نے اس دور کے مسلمانوں کے لیے "مسلمانانِ ہند و مزاج" کی اصطلاح استعمال کی ہے، یہ وہ لوگ تھے جن کی نگاہ میں "رام" اور "رحیم" ایک ہی شخصیت کے دو نام تھے، یہی وہ دور ہے جب خیر پورہ، دھرم پورہ، سنت پورہ اور جوگی پورہ جیسے ناموں سے مختلف بستیاں اور سرائیں وجود میں آئیں۔ "صلحِ کل" کے اس تصوّر نے ریاست اور نظامِ حکومت کو اسلام کے اصولوں پر استوار کرنے کے تمام امکانات کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔

دورِ مجددؒ میں عالمی سطح پر بھی مذہب کے حوالے سے نئے رجحانات مذہبی حلقوں میں بے چینی پیدا کر رہے تھے۔ اس دور میں دنیا کے فکری محاذ پر دو بڑی اہم تحریکوں کا ظہور ہوا، ان میں سے ایک اہلِ نقطہ یا "نقطوی تحریک" ہے۔ جس کا ظہور ایران میں ہوا۔ اس فرقہ کا بانی محمود پسیخوانی تھا۔ نقطویوں کا یہ عقیدہ تھا کہ محمود پسیخوانی کے ظہور سے عربوں کی سرداری ختم ہو گئی ہے لہٰذا آئندہ آٹھ ہزار سال تک پیغمبر عجمیوں میں ہی پیدا ہوا کریں گے۔ ان کے نزدیک مذہب اسلام ختم ہو چکا ہے۔ نقطوی تحریک کے بانی دراصل ایرانی علما تھے۔ نقطوی فرقہ کے مبلّغین نے ہندوستان آکر "الف ثانی" کے لیے نئے دین اور نئے آئین کے لیے راستہ صاف کیا، جب انھیں اکبری دور کے علما سو کی تائید وحمایت حاصل ہو گئی تو انھیں اس کے پورے مواقع ملے اور ان کے عقائد اکبر کے دین الٰہی میں شامل ہو گئے۔ یہی وہ تحریک ہے جس کے زیر اثر اکبر بادشاہ نے یہ فرض کر لیا کہ حضور نبی آخر الزمان ﷺ کی بعثت کے ہزار سال پورے ہو چکے ہیں اور دینِ اسلام کی مدت بھی ختم ہو گئی ہے۔ اس فرقہ نے دسویں صدی ہجری میں ہندوستان و ایران کے ہزاروں لوگوں کو متاثر کیا اور ایران میں اس کے پیروؤں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ "نقطوی تحریک" کے اثرات نے عالمِ اسلام بالخصوص برِّ صغیر کے فکری اُفق پر ہنگامہ برپا کر دیا۔ اکبر کے دینِ الٰہی نے حقیقت میں نقطوی تحریک کے زیر اثر ہی ظہور کیا تھا۔ اس تحریک کا بنیادی فلسفہ ہی یہ تھا کہ اسلام صرف عربوں کا دین ہے اور یہ دین ایک ہزار سال گزارنے کے بعد اپنی طبعی عمر پوری کر چکا ہے، لہٰذا اب دوسری ہزاری کے لیے ایک نئے دین اور فلسفۂ حیات کی ضرورت ہے۔[34]

دوسری طرف مذاہب کے عالمی منظر نامے پر مارٹن لوتھر (1546-1443ء) نے روایتی مسیحیت کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے پروٹسٹینٹ (Protestant) فرقے کی بنیاد رکھی۔ مارٹن لوتھر کو جدید عیسائیت میں "مجتہدِ مطلق" سمجھا جاتا ہے۔ عقلی بنیادوں پر اٹھنے والی اس تحریک نے صرف مسیحیت ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام مذاہب کے لیے خطرے کی گھنٹی بجادی۔ اس تحریک کے عالم گیر اثرات کے نتیجے میں ان تمام مذاہب کو اپنا وجود خطرے میں محسوس ہو رہا تھا جن کی تعلیمات وحی و الہام پر مبنی ہونے کی بجائے مذہبی طبقے کی ذہنی اختراعات اور ذاتی مفادات پر مبنی تھیں اور

اہلِ مذہب نے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے ان تعلیمات کو خدا کی طرف منسوب کر رکھا تھا۔ اگر ان تاریخی حوالوں کو پیشِ نظر رکھا جائے جن کے مطابق اکبر کے دربار میں عیسائی علما کا ایک مستقل گروہ حاضر رہتا تھا اور تورات و انجیل کے فارسی تراجم بھی خاص طور پر بادشاہ کے لیے حاصل کیے گئے تو اس بات میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ اکبر عیسائی مذہب میں برپا ہونے والی پروٹسٹنٹ تحریک سے پوری طرح واقف تھا، اور وہ اسلام میں بھی اسی نوعیت کی تبدیلیوں کا خواہاں تھا۔ اسی پس منظر میں ملا مبارک نے بادشاہ کے لیے 987ھ میں "مجتہدِ مطلق" کا عہدہ تخلیق کیا، تاکہ بادشاہ اپنی مرضی سے مذہب کی تجدید نو کر سکے۔ عالمی حالات اور خود برِّ صغیر کے داخلی حالات نے طالع آزماؤں کو حوصلہ دیا کہ وہ براہِ راست اسلام پر حملہ آور ہوں۔ ہندوستان اور عالمی سطح پر مذہب کے حوالے سے جنم لینے والے شکوک و شبہات کے تناظر میں حضرت مجددؒ کی تحریکِ دعوت کو درپیش چیلنجز کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اکبری عہد کی مذکورہ بالا مختلف مذہبی تحریکوں کا تحقیقی نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ اس عہد کا سب سے اہم مسئلہ نبوتِ محمدی کی ابدیت کا استقرار تھا۔ اس لیے کہ نظریہ مہدویت، عقیدۂ امامت، نظریہ الفی اور دینِ الٰہی جیسی تحریکوں نے کسی نہ کسی طرح سید الانبیاء آنحضرت ﷺ کے اعلیٰ وارفع مقام پر ضرب لگائی تھی۔ حضرت مجدّد الف ثانیؒ کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ آپؒ نے ان تمام گمراہیوں اور ضلالتوں پر ضرب کاری لگائی، اور عالمِ اسلام بالخصوص برِّ صغیر کے مسلمانوں کو ان تحریکوں کے اثرات سے محفوظ رکھنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

حضرت مجددؒ نے صوفیائے خام کے اس گمراہ کن نظریہ، کہ شریعت اور طریقت الگ ہیں، پر بھی کاری ضرب لگائی اور اس بات کو اپنے دعوتی مشن کا بنیادی نقطہ قرار دیا کہ شریعت اور طریقت ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ ایک مکتوب میں میر محمد نعمان کو چند نصیحتیں کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہمارے اس سلسلے کا دارومدار دو باتوں پر ہے۔ ایک یہ کہ شریعت پر اس حد تک استقامت اختیار کریں کہ اس کے چھوٹے چھوٹے آداب کو بھی نہ چھوڑیں اور دوسری بات یہ کہ شیخِ طریقت کی محبّت اور اخلاص پر اس طرح مضبوط اور ثابت قدم ہو جائیں کہ شیخ پر کسی قسم کا سوال نہ اٹھائیں بلکہ

شیخ کی تمام حرکات و سکنات مرید کی نظر میں محبوب ہوں۔ سنّت کے چھوڑنے پر بھی نصیحت فرمائی کہ سنّت کی قضا کریں۔[35]

شیطان کے بڑے جالوں میں سے ایک جال یہ ہے کہ وہ امورِ شرعیہ کے بارے میں انسان کے دل میں طرح طرح کے غلط خیالات ڈال کر اسے گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی تو یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ اسلامی احکام خلافِ عقل ہیں، اسلامی احکام موجودہ دور کی ضروریات کے مطابق نہیں ہیں اور ان پر عمل کرنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہے حضرت مجدّدؒ نے خانِ خاناں کے نام ایک تفصیلی خط اس مضمون کا ارسال فرمایا کہ امورِ شرعیہ میں پوری آسانی اور سہولت کا لحاظ رکھا گیا ہے مقیم و مسافر، مریض و تندرست اور مرد و زن دونوں کے دائرہ کار اور نفسیات کے مطابق تعلیمات دی گئی ہیں۔ اب اس اہتمام کے بعد بھی جو شخص عمل نہ کرے وہ حقیقت ایمان سے محروم ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ اسلام دین فطرت ہونے کے ساتھ ساتھ دین عقل بھی ہے لیکن کون سی عقل معیارِ حق ہوگی ؟ یہ ایک اہم سوال ہے، حقیقت یہ ہے کہ عقل ایک ایسی کمزور اور بے بس راہنما ہے جس کو انسانی خواہشات اور جذبات نے ہمیشہ اپنا محکوم بنا کر رکھا ہے اور عقل نے ہمیشہ انسانی جذبات و خواہشات کے حق میں دلائل تراشے ہیں اور خواہشاتِ نفس اور جذباتی رویوں کو عقلی رویے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ عقل جج نہیں وکیل ہے، جیسا مقدمہ اسے دیا جائے گا اس کے مطابق وہ وکالت کرے گی۔ یہ ایک ایسی دو دھاری تلوار ہے جو دونوں طرف چلتی ہے اس سے جس طرح دینی حقائق کو ثابت کیا جا سکتا ہے اسی طرح باطل بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ وکیل کی وکالت و ذہانت پر موقوف ہے کہ وہ مقدمہ کے کس پہلو کو ماننا یا نہیں ماننا چاہتا۔ اس لیے ہر شخص کو اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ اپنی عقل کا ترازو لے کر آگے بڑھے اور احکامِ شرعیہ کے حق و باطل ہونے کا فیصلہ کرنے بیٹھ جائے۔ معیارِ حق عقل نہیں بلکہ وحی ہے۔ بہر حال حضرت مجددؒ کے دور میں عقل پرستی عروج پکڑ رہی تھی، اور یہی وہ دور ہے جس میں وہ تمام چیزیں جن کا تعلق نبوّت و رسالت سے تھا، ان کا نام "تقلیدات" رکھا گیا اور اس نوعیت کے تمام تصوّرات کو غیر معقول ٹھہرا کر رد کر دیا

گیا اور یہ دعویٰ کیا گیا مذہب کی بنیاد عقل پر ہے نہ کہ نقل پر۔ یہ ہے وہ پس منظر جب

ایک مکتوب میں محضرت جدّدؒ خانِ خاناں کے نام تحریر فرماتے ہیں:

"جو شخص یہ چاہتا ہے کہ تمام احکامِ شرعیہ کو عقلی پیمانے پر ناپے اور دلائل عقلیہ کے مطابق کر دے، وہ شانِ نبوّت کا منکر ہے اور اس کے ساتھ کلام کرنا کم عقلی و بے وقوفی ہے۔"(36)

حضرت مجدّدؒ اپنے ایک دوسرے مکتوب میں تحریر کرتے ہیں:

"عقل اگر معرفتِ الٰہی کے مسئلہ میں کافی ہوتی تو فلاسفہ یونان جنھوں نے عقل کو اپنا راہبر بنایا تھا، گمراہی کے جنگلوں میں نہ گمراہ ہوتے اور حق تعالیٰ کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ پہچانتے۔(37)

یہ وہ پس منظر ہے جس میں حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے اپنے مختلف رسائل اور خطوط میں اسلامی عقائد و نظریات اور احکام کو نقل کے ساتھ عقل کی بنیاد پر انسانیت کی آخری امید کے طور پر واضح کیا۔ اس دورِ پُر فتن میں ان زلزلہ انگیز تحریکوں کا مقابلہ حضرت مجددؒ جیسی شخصیت ہی کر سکتی تھی۔ آپؒ نے اسلامیانِ ہند کو تہذیبی ارتداد سے بچا کر مسلم تشخص کا تحفظ کیا اور دین اسلام کو عقل و فطرت سے ہم آہنگ فرما کر ارکانِ سلطنت اور اربابِ بست و کشاد کو قائل کیا کہ انسانیت کی فلاح اسی میں ہے کہ نظامِ ریاست و حکومت کو اسلامی اصولوں پر استوار کیا جائے۔ نبوت محمدی کی ابدیت، اسلام کی عالمگیریت اور آفاقیت کا اثبات، نیز اسلامی عقائد و نظریات کو عقلی اور فطری اصولوں کے موافق ثابت کرنا آپ کا ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جس نے آپ کو تاریخ میں ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔

رجال کار کی تیاری سے اصلاحِ احوال:

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ وہ تمام تحریکیں، تصوّرات اور عقائد و نظریات جو محض ریاستی و حکومتی سرپرستی کے زیر اثر پروان چڑھتے ہیں، ریاستی اور حکومتی مظہر ہونے کے باعث ان کی عمر مختصر ہوتی ہے۔ دوسری صدی ہجری میں عالمِ اسلام کو ہلا کر رکھ

دینے والی معتزلی تحریک جلد ہی اپنے انجام کو پہنچ گئی، کیوں کہ اس کی بقا ریاستی سرپرستی کے ساتھ جڑی ہوئی تھی، یہ چھتری ہٹتے ہی تحریکِ اعتزال تاریخ کا حصّہ بن گئی۔ معتزلہ کے مقابلے میں خوارج کی مزاحمت زیادہ سخت تھی، مؤقف غلط ہونے کے باوجود خوارج کے نظریات کی نمود چوں کہ دھرتی اور سماج کے اندر سے ہوئی تھی لہٰذا اس فتنے کے تدارک کے لیے جنگ کا میدان سجھانے کی بجائے سماج کے اندر کھڑے ہو کر ان کا علمی اور فکری میدان میں مقابلہ ضروری تھا۔ فکری محاذ پر خوارج کے بارے جو تاہل برتا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عالمِ اسلام تادیر خوارج کے ہاتھوں پریشان حال رہا۔ فکری محاذ پر کام کرنے والے افراد اور تحریکیں اس فرق کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھتی ہیں۔

برِّ صغیر کے فکری محاذ پر بھی صورتِ حال کچھ اسی نوعیت کی تھی۔ ظاہر بین نگاہوں کو شاید اکبر کے "دین الٰہی" ہی کی صورت میں ایک فتنہ نظر آرہا تھا، لیکن حضرت مجدّدؒ جانتے تھے کہ حکومتی چھتری کے بغیر یہ فتنہ جلد ہی اپنی موت آپ مرنے والا ہے۔ چناں چہ جلال الدین محمد اکبر کی وفات کے بعد حالات میں بتدریج بہتری آنے لگی، اور پھر وہ مرحلہ بھی آگیا جب خود مغل دربار کی طرف سے آپؒ سے درخواست کی گئی کہ دربارِ مغلیہ میں چند علما کرام کا مستقل تقرر کر دیا جائے جو غیر شرعی امور کی نشاندہی کریں اور دینی راہ نمائی کے لیے ارکانِ سلطنت کی مدد فرمائیں۔ مجددی تذکرہ نگاروں نے جو حالات بیان کئے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت مجدّد الف ثانیؒ مغل حکمران اکبر کی پھلائی ہوئی گمراہیوں اور فتنہ انگیزیوں سے زیادہ ان فتنوں کے بارے فکر مند تھے جو سماجی ہونے کے اعتبار سے طویل العمر اور گہرے اثرات کے حامل ہو سکتے تھے۔ آپ بڑی دور اندیشی سے اعتقادی دھند میں چھپے ہوئے ان فتنوں کو دیکھ رہے تھے جو اسلامیانِ ہند بلکہ پورے عالمِ اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے سکتے تھے۔ ایک طرف آپؒ ابو الفضل اور فیضی کے زیر اثر "تجدد پسندی" کی لہر کو ملاحظہ فرما رہے تھے اور دوسری طرف عالمی افق پر مسلم تہذیب و ثقافت پر اثر انداز ہونے والے خارجی عوامل کو بھی تنقیدی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔

حضرت مجددؒ نے ایک انتہائی دور رس فیصلہ کیا، آپؒ نے برِّ صغیر سے آگے بڑھ کر پورے عالمِ اسلام کو فکری اور تہذیبی ارتداد سے بچانے کے لیے ایسے افراد اور مبلّغین کی

جماعت تیار کی جنھوں نے آپ کی دعوتی و اصلاحی تحریک کو ایک عالمگیر تحریک میں تبدیل کر دیا۔ آپ کے مبلّغین وسطی ایشیا اور عالمِ عرب تک پہنچ گئے۔ جہانگیر کا دور حضرت مجددؒ کی برپا کردہ اصلاحی تحریک کا دورِ عروج کہا جا سکتا ہے، 1027ھ تک آپؒ کے داعی پوری دنیا میں پھیل چکے تھے۔ آپؒ نے اپنے بہت سے خلفاء کو تبلیغ اور ہدایت کے لیے مختلف مقامات کی طرف روانہ فرمایا۔ ان میں ستر (70) مولانا محمد قاسم کی قیادت میں ترکستان کی طرف روانہ کئے گئے۔ مولانا فرح حسینؒ کی امارت میں چالیس (40) حضرات کو عرب، یمن، شام اور روم کی طرف روانہ کیا گیا۔ مولانا محمد صادق کابلیؒ کی قیادت میں دس (10) تربیت یافتہ لوگوں کو کاشغر کی طرف بھیجا گیا۔ مولانا شیخ احمد برکیؒ کی قیادت میں تیس (30) مبلّغین توران، بدخشاں، اور خراسان کی طرف روانہ کئے گئے۔ ان تمام حضرات کو اپنے اپنے مقامات پر زبر دست کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ مجددی خانقاہوں نے نہ برِّ صغیر بلکہ عالمِ اسلام پر گہرے اثرات مرتب کئے۔[38]

حضرت مجددؒ نے نبی کریم ﷺ کی سنّت کے مطابق اپنے خلفاء کے وفود کو مختلف ممالک کے حکمران طبقوں کے پاس بھیج کر اسلام کی تعلیمات اور نبوی وراثت سے روشناس کرایا اور انھیں اپنی اصلاح کی دعوت دی، چنانچہ اس کے زبر دست اثرات مرتب ہوئے۔ ہندوستان اور کئی دوسرے اسلامی ممالک میں حکمراں، امرا اور وزرا نے آپ کی تربیت قبول کی اور شکریہ ادا کیا، اگر یہ سچ ہے کہ قوم کے امرا و سلاطین صراطِ مستقیم پر آجائیں تو پوری قوم ہدایت کی راہ پر چلنے لگتی ہے، تو حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے دور میں اس سچائی کا مشاہدہ واضح طور پر کیا جا سکتا ہے، کہ جب یمن، شام، ایران، عراق اور روس وغیرہ سے عوام النّاس تزکیۂ نفس اور رشد وہدایت کے لیے آپؒ کی خدمت حاضر ہونے لگے۔

حضرت مجدّدؒ نے پورے ہندوستان کے کونے کونے میں اپنے مبلغین روانہ فرمائے۔ آپؒ نے جابجا اپنے خلفاء کو دعوتی مشن پر مامور فرمایا، خواجہ میر محمد نعمان کو خلافت عطا فرما کر دکن بھیجا، ان کی خانقاہ میں کئی کئی سو سوار اور بے شمار پیادہ ذکر و مراقبہ کے لئے حاضر ہوتے تھے۔

شیخ بدیع الدین سہارنپوری (م1042ھ): ان کو خلافت عطا فرما کر پہلے سہارنپور پھر شاہی لشکر گاہ آگرہ میں تقرّری کی، ان کو وہاں شہرت حاصل ہوئی، بہت سے ارکان سلطنت ان کے حلقہ بگوش ہوئے لشکر کے ہزارہا آدمی عقیدت مند ہوئے، ہر روز اس قدر ہجوم ہوتا کہ بڑے بڑے امرا کو مشکل سے شیخ کی زیارت نصیب ہوتی۔

میر محمد نعمان کشمی (964ھ): جو حضرت خواجہ باقی باللہ کے خلفاء میں تھے تجدید بیعت و اجازت نامہ مرحمت فرما کر برہان پور روانہ فرمایا اور آپ وہاں لوگوں کے منظورِ نظر بن گئے، اور لوگوں کی بڑی اصلاح ہوئی۔

شیخ طاہر لاہوری (م1040ھ): شہر لاہور کے، جو ہندوستان کا دوسرا علمی و سیاسی مرکز تھا طالبان معرفت کی رہنمائی کے لیے روانہ فرمایا، اور ان سے اس علاقہ میں بڑا فیض پہنچا۔۔

شیخ حمید بنگالی: (م1050ھ) ان کو مقامات سلوک طے کرا کر اور تعلیم و طریقت کی اجازت دے کر بنگلہ روانہ کیا، شیخ عبدالحی حصار شادماں (علاقہ اصفہان) کے باشندہ تھے مکتوبات کا دفتر ثانی آپ ہی کا ترتیب دیا ہوا ہے، حضرت نے آپ کو تعلیم و طریقت کی اجازت دے کر شہر پٹنہ روانہ فرمایا، شیخ عبدالحی شہر کے درمیان تشنگانِ طریقت کی پیاس بجھاتے تھے، اور شیخ نور محمد دریائے گنگا کے کنارے لوگوں کو صراطِ مستقیم پر بلاتے تھے۔

عرب وعجم میں آپ کے خلفاء: مجدد الف ثانی نے 1026ھ میں خلفاء کو تبلیغ کے لیے مختلف مقامات کی طرف روانہ کیا، 1027ھ مکمل نہیں ہوا تھا کہ حضرت مجدد کی جلالتِ شان اور قوتِ ارشاد و حسنِ تربیت کا آوازہ بیرون ہند تک پہنچ چکا تھا، لوگ جوق در جوق زیارت واستفادہ کے لئے آنے لگے، ماوراء النہر، بدخشاں، کابل اور بعض دوسرے عجمی ممالک کے بہت سے شہروں میں آپ کے خلفاء موجود تھے، اور عرب ممالک تک بھی آپ کی شہرت پہنچ گئی تھی، ہندوستان میں تو مشکل سے کوئی شہر ہوگا جہاں آپ کے خلفاء اور اللہ کی طرف دعوت دینے والے موجود نہ ہوں۔

حضرت مجدّدؒ کے خلفائے عظام کے کارناموں کا شمار مشکل ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہے کہ ان کی تعداد کم بیش پانچ ہزار بتائی جاتی ہے، اور وہ تمام دنیا میں منتشر اور سر

گرم عمل رہے، خلفاء میں متعدد اصحاب کے نام جن کو آپ نے بعض بیرونی ممالک میں اصلاح و تربیت کا کام تفویض کرکے روانہ فرمایا تھا یا ہندوستان کے بعض اہم مقامات پر اس خدمت میں مامور فرمایا تھا اُن میں سرفہرست آپؒ کے صاحبزادگان کے اسمائے گرامی آتے ہیں جن کی بدولت برصغیر پاک و ہند اور دنیا کے دیگر علاقوں میں سلسلہ عالیہ کی ترویج و اشاعت ہوئی اگرچہ آپ کے صاحبزادگان کی تعداد سات تھی مگر تین صاحبزادے جناب شیخ محمد فرخ، شیخ محمد عیسی اور محمد اشرف اوائل عمر ہی میں فوت ہوگئے اور آپ کے صاحبزادے محمد یحی کم عمر تھے۔ آپ کے صاحبزادے جنہوں نے آپ سے اکتساب فیض کیا وہ حضرت خواجہ محمد صادق، حضرت خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم (م1079ھ) تھے۔ حضرت مجددؒ کے بعض دیگر خلفاء میں حضرت سید آدم بنوری(م1053ھ)، حضرت شیخ طاہر بدخشی، (م1047ھ)، شیخ احمد برکی(م1058ھ)، شیخ عبد الحیی شادمانی، شیخ محبت اللہ مانکپوری، مولانا عبد الواحد لاہوری، خواجہ باقی آدم بنوری کاظمی(م1053ھ) قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے مجددی فکر کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔[39]

حضرت مجددؒ نے نظامِ ریاست وحکومت کی بہتری کے لیے ملک کے کونے کونے میں تربیت یافتہ علما پھیلا دیئے اور لوگوں پر واضح کیا کہ شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ اور تحفظ اور اشاعت اصلِ دین ہے۔ آپؒ نے نہ صرف مریدین اور علما کو اکنافِ عالم میں پھیلا دیا بلکہ افغانستان اور بدخشاں میں خطوط اور وفود کی صورت میں لوگوں کو دعوتی مشن پر روانہ فرمایا۔ آپؒ شریعت کی اہمیت کو پوری طرح واضح کیا اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغل حکمران عالمگیر کو سوائے انتظام اور شریعت کے نفاذ کے کوئی کام نہ تھا، اس سے پہلے جہانگیر خود آخری سالوں میں شریعت کے نفاذ کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ شاہجہان نے سجدۂ تعظیمی بالکل ختم کر دیا۔ کثرت سے مدارس بنوائے، علم کی سرپرستی اور علما کی خدمت میں خوب خرچ کیا۔ یہ سب حضرت مجددؒ کی تحریک کا نتیجہ تھا۔

مبلّغین کی دستگیری اور حوصلہ افزائی:

مبلّغ کے لیے وہ مرحلہ بڑا صبر آزما ہوتا ہے جب کچھ لوگ بلاوجہ اس پر طعن و تشنیع کے تیروں کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ اس مرحلہ پر صرف وہی مصلح اور داعی صراطِ مستقیم پر گامزن رہتا ہے جس کو یہ مشن اپنی عزت و آبرو اور جان و مال سے بھی زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ دعوت تو حق کی دی جا رہی ہو اور شیطان اس کے مقابل اپنے چیلوں کو کھڑا نہ کرے۔ یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جب داعی کی استقامت سلیم الفطرت انسانوں کے دلوں پر لگے ہوئے قفل کو توڑ کر ان پر حق کو روشن کر دیتی ہے۔ لہٰذا ایسے مواقع پر مصلح کو صبر سے کام لینا چاہئے۔ ایک ایسے ہی موقع پر جب اہلِ خران نے حضرت میر محمد نعمان کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا اور آپ کو اس کا شدید رنج پہنچا، جس کا ذکر انھوں نے حضرت مجدد سے کیا تو حضرت مجدد نے ان کی طرف ایک مکتوب تحریر فرمایا اور ان کو تسلی دی کہ آپ لوگوں کے طعنوں کو خاطر میں نہ لائیں بلکہ اس مشن پر گامزن رہیں جو آپ کے ذمے لگایا گیا ہے۔ پھر آپ حضرت میر نعمان کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ آپ کے لائق ہے کہ ان کے بدلے اور مکافات کے درپے نہ ہوں جھوٹے کو کبھی نورِ ہدایت نصیب نہیں ہوتا حقیقت کے متضاد باتیں ہی ان کے بازار کی رونق کو کم کر دیں گی۔ "وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ" (النور 40:24) (جس کے لیے اللہ نے کوئی نور نہیں بنایا اس کے لئے کوئی نور نہیں۔) وہ شغل جو درپیش ہے اس میں کوشش کریں اور اس کے غیر سے آنکھیں بند کر لیں۔)(40)

حضرت مجدّدؒ کو اپنے دعوتی مشن سے کس قدر تعلق خاطر تھا اس کی وضاحت ایک دوسرے مکتوب سے ہوتی ہے، جس کی عبارت سے محسوس ہوتا ہے کہ حضرت میر نعمان اس بات سے پریشان تھے کہ حضرت مجددؒ کو ان کی کسی بات سے دکھ اور رنج پہنچا ہے۔ حضرت مجددؒ نے ان کے ان شکوک و شبہات کو دور کیا اور کہا کہ ان کو ان کی کسی بات سے رنج نہیں پہنچا کیونکہ انسان سے اگر بتقاضائے بشریت کوئی بھول چوک ہو جائے تو اس پر کوئی پکڑ نہیں۔ لہٰذا آزار کا وہم دل سے دور کر کے طریقت کی تعلیم دینے اور طالبعلموں کی تربیت میں اپنا دھیان دیں۔"(41)

داعیانِ اسلام کا فقر و فاقہ میں مبتلا ہونا کوئی نئی بات نہیں بلکہ اس راہ پر چلنے والے مشکلات سے کم ہی محفوظ رہ پاتے ہیں۔ جب داعی پر "الفقر فخری" کی حقیقت کھل جاتی ہے تو پھر وہ فقر و فاقہ میں بھی ایک طرح کا کیف و سرور محسوس کرتا ہے۔ حضرت

مجدّدؒ کو جب میر نعمان اور ان کے ساتھیوں کی مالی پریشانیوں کی خبر ملی تو ان کی طرف جو مکتوب روانہ فرمایا اس میں لکھا کہ فقر و نامرادی ہی اس گروہِ صوفیہ کا اصل حسن ہے اور اس میں حضور ﷺ کی حقیقی پیروی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے رزق کا ذِمّہ اپنے اوپر لیا ہے اور انسان کو اس فکر و رنج سے فارغ کر دیا ہے۔ پھر ان کو نصیحت کی کہ رزق کا غم رازق کے حوالے کر کے اس کے کام میں مصروف ہو جائیں۔(42)

آپؒ ایک دوسرے مکتوب میں اپنے ذاتی احوال بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ان پر اس راہِ طریقت میں سختیاں آئیں اور کن کٹھن حالات میں انھوں نے یہ راہ کاٹی اور وہ درمیان میں پھنس کر رہ گئے، یہاں تک کہ ناامیدی کے دروازے پر دستک دینے لگے اور پھر اس صورت حال میں اللہ تعالیٰ نے مجھے مصائب کے اندر عافیت بخشی اور سختی کی حالت میں مجھ پر احسان فرمایا، اور پھر آپ نے میر صاحب کو یہی تعلیم دی کہ راستے کی تکلیفوں سے گھبرا جانے والے منزل مقصود پر نہیں پہنچتے۔ اس کے لیے صبر اور حوصلے سے کام لینا ضروری ہے۔(43)

اس ساری گفت گو کا حاصل یہ کہ حضرت مجدّدؒ کی نظر میں ایک سچے مبلغ کو ہر طرح کی مصیبتوں کو ہنسی خوشی سے برداشت کرنا چاہیے۔ ہر دور میں اہل اللہ کا یہی طریقہ رہا ہے۔ اور جو لوگ دعوتِ حق کی راہ میں مشکلات کھڑی کریں ان سے بدلہ لینے کے بجائے مصلح اور مربی کو اپنے مشن پر گامزن رہنا چاہیے۔

خلاصۃ البحث:

ریاستِ مدینہ اور خلفائے راشدین کے معجزانہ ادوار کے استثناء کے ساتھ تلخ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کے کسی بھی دور میں عوام کو کبھی براہِ راست اقتدار نہیں ملا۔ موجودہ دور کو سلطانیٔ جمہور کا دور کہا جاتا ہے۔ کئی صدیوں کے تہذیبی ارتقاء کے بعد جس نظامِ جمہوریت کو مغرب بڑے فخر کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے اس نظام میں بھی اصل اقتدار اعیانی طبقات (Elites) کے پاس ہی ہوتا ہے۔ سرمایہ دار طبقہ سیاسی جماعتوں کو سرمایہ فراہم کرتا ہے اور ان کی پالیسیوں پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس طرح اقتدار اعیانی طبقات میں ہی گردش کرتا رہتا ہے۔ پاکستان میں بھی زمینی حقیقت یہی ہے کہ زیادہ تر سیاسی جماعتیں مختلف مسلکی اور گروہی عصبیتوں یا خاندانوں کے ہی زیر اثر ہیں اور ان کی

حیثیت مقتدرہ کے سہولت کار کی ہے، گویا پاکستان میں ایک محدود جمہوری نظام(Controlled Democracy) قائم ہے، لیکن اصل اقتدار مقتدرہ کے پاس ہے۔پاکستان کے قیام سے لے کر آج تک مختلف دینی و سیاسی تحریکیں ظاہر ہوتی رہی ہیں جنہوں نے اپنی بساط کے مطابق پاکستان میں نفاذ شریعت کے لیے بڑی جدوجہد کی اور قربانیاں بھی دیں۔ لیکن کسی بھی دینی تحریک یا دینی سیاسی جماعتوں کو پاکستان میں نفاذ شریعت کے حصول میں کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ بلکہ آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں تقریباً تمام دینی سیاسی جماعتوں کا امیج عوام کی نگاہ میں گرتا جارہا ہے اور عوام بظاہر اب دینی و سیاسی جماعتوں پر اور انکے کردار پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نظر نہیں آتی۔ دوسری طرف حکومت کا طرزِ عمل بھی اسلام، حامیان اسلام اور نفاذِ شریعت کے حوالے سے انتہائی منافقانہ اور باعیبانہ ہے۔ان حالات میں وہ علمائے حق اور مشائخ عظّام جو پاکستان میں نفاذِ شریعت کے قیام کے خواہ ہیں۔ان کے پاس ممکنہ طور پر دو راستے ہو سکتے ہیں:

پہلا راستہ یہ ہے کہ حکومتِ وقت کو اسلام کا مخالف اور دشمنِ دین قرار دے کر اس کے خلاف ایک دینی محاذ قائم کر لیا جائے اور اس کی مستقل مخالفت کرتے ہوئے حکومت کے خلاف صف آرائی کر لی جائے، جیسا کہ تمام اسلامی ممالک میں اور بالخصوص ہماری سیاست میں آج تک ہوتا چلا آرہا ہے، جس کا نتیجہ بھی ہمارے سامنے ہے کہ ہماری حکومتیں اور ہمارا معاشرہ دونوں ہی اسلام اور اسلامی اقتدار سے مزید دور ہوتے جارہے ہیں، سوائے ناکامی اور شرمندگی کے ہماری دینی سیاسی جماعتوں کے ہاتھ میں کچھ نہیں آیا، اگر کسی کے ہاتھ کوئی منصب آبھی گیا تو اسے یا تو حکومت کا آلہ کار یا پھر بے بسی کی تصویر بننا پڑا۔

دوسرا راستہ وہی ہے جو امامِ ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اختیار کیا یعنی با اثر ارکانِ پارلیمنٹ، وزرائے مملکت، نوکر شاہی اور فوجی آفیسرز سے تعلقات استوار کر کے ان کی ایمانی حرارت اور دینی حمیت کو ابھار کر انھیں ان کی دینی و ملی ذِمّہ داریوں اور فرائض کا احساس دلایا جائے اور انھیں حکومتِ وقت کو نیک مشورے دینے پر آمادہ کیا جائے تاکہ حکومتِ وقت کو اسلام کی حمایت، حدود اللہ کے تحفظ اور شعائر اسلامی کے قیام کے لیے آمادہ کیا جا سکے۔ حضرت مجددؒ کے طریقِ کار سے واضح ہوتا ہے کہ ایک سچے داعی کے لیے اعیانی طبقات کی

اصلاح اور ان کو وسیلہ بنا کر مخلوقِ خدا کی بھلائی اور ان کی ضروریات کے لیے کوشاں رہنا ہی ایک بہتر راستہ ہے۔

تاہم مجدّدی طریقِ کار کی کامیابی اس حقیقت کے ادراک کے ساتھ مشروط ہے کہ دینی تحریکیں اپنے دور کے چیلنجز، تحدّیات اور معروضی حالات سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ ہماری رائے میں وہ اسلامی ممالک جہاں آج بھی شخصی اور خاندانی حکومتوں کا سلسلہ جاری ہے وہاں نظامِ ریاست و حکومت کی اصلاح کے لیے حضرت مجددؒ کا یہ اسلوب زیادہ کارگر ہو سکتا ہے کہ اقتدار سے لاتعلق رہ کر اور مقتدرہ(Establishment) کے حریف کے بجائے حلیف بن کر حالات کو سدھارا جائے، اور وہ ممالک جہاں کمزور ہی سہی جمہوری طرزِ سیاست موجود ہے وہاں عوام کے زندہ مسائل، بنیادی انسانی حقوق اور خدمتِ خلق کے اصول کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اسلامی تحریکیں عوام میں اپنے اثر و رسوخ کو اصلاحِ احوال کے لیے بنیاد بنائیں، اور اگر وہ شخصی یا بطور جماعت اقتدار کی سیاست میں اترنا چاہتے ہیں تو لوگوں کے معاشی اور سماجی مسائل کی بنیاد پر حمایت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

حواشی و تعلیقات

(1) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سید ابو الاعلیٰ مودودی، (م 1979ء) "اسلامی ریاست" ص:640-644، (اسلامک پبلی کیشنز منصورہ، لاہور، 2010ء)

(2) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

(i) مولانا وحید الدین خان (م 2021ء) "تعبیر کی غلطی"، (مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی، 1995ء)

(ii) علامہ جاوید احمد غامدی (پ 1951ء) اپنے ایک مضمون "اسلامی ریاست ایک جوابی بیانیہ" میں لکھتے ہیں کہ ریاست کا کوئی مذہب یا دین نہیں ہوتا اور خلافت کوئی دینی اصطلاح نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (ماہنامہ "اشراق"، لاہور، فروری 2015ء)

(3) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سید ابو الاعلیٰ مودودی، (م 1979ء) "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں"، (اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، 1991ء)

(4) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سید ابو الحسن علی ندویؒ (م 1999ء) "تاریخ دعوت و عزیمت" 3/ 81-85، مجلدات:7، (مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی، پاکستان)

(5) " روضۃ القیومۃ" ص:327، خواجہ محمد احسان مجدّدی سرہندیؒ، (مکتبہ نبویہ، لاہور، 2002ء)، مجلدات:4

(6) حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ، "مکتوباتِ امام ربّانی، دفتر اوّل، مکتوب نمبر:47، (مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی، 1970ء)، مجلدات:3

(7) دفتر اوّل، مکتوب نمبر:51

(8) دفتر اوّل، مکتوب نمبر:193

(9) دفتر اوّل، مکتوب نمبر:65

(10) دفتر دوم، مکتوب نمبر:67

(11) دفتر سوم، مکتوب نمبر:54

(12) دفتر اوّل، مکتوب نمبر:81

(13) دفتر اوّل مکتوب نمبر:195

(14) دفتر اوّل مکتوب نمبر:23

(15) دفتر اوّل مکتوب نمبر:53

(16) دفتر سوم مکتوب نمبر:43)

(17) دفتر اوّل، مکتوب نمبر:79

(18) دفتر اوّل، مکتوب نمبر:78

(19) دفتر اوّل، مکتوب نمبر108

(20) دفتر اوّل، مکتوب نمبر:111

(21) دفتر دوم، مکتوب نمبر:60

(22) دفتر اوّل، مکتوب نمبر:69

(23) دفتر اوّل، مکتوب نمبر:67

(24) دفتر اوّل، مکتوب نمبر:232

(25) دفتر اوّل، مکتوب نمبر:72

(26) دفتر اوّل، مکتوب نمبر:25

(27) دفتر اوّل، مکتوب نمبر:56

(28) دفتر اوّل، مکتوب نمبر:96

(29) دفتر سوم، مکتوب:نمبر:54

(30) دفتر سوم، مکتوب نمبر:59

(31) دفتر سوم، مکتوب نمبر:86

(32) دفتر اوّل، مکتوب نمبر:74

(33) دفتر اوّل، مکتوب نمبر:68

(34) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: "تحریکِ نقطوی اور "دینِ الٰہی" پر اس کے اثرات "، ماہنامہ "معارف "اعظم گڑھ، انڈیا، جلد:170 شمارہ:1، جولائی2002ء

(35) دفتر اوّل، مکتوب نمبر:228

(36) دفتر اوّل، مکتوب نمبر:114

(37) دفتر سوم، مکتوب نمبر213

(38) "روضۃ القیومیۃ"، 1/144-167

(39) سید ابوالحسن ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، جلد:4 ص:124/125

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: شیخ محمد اکرام "رودِ کوثر" ص:442-456، (ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور، 2009ء)

(40) دفتر اوّل مکتوب نمبر:204

(41) دفتر اوّل، مکتوب نمبر:224

(42) دفتر اوّل، مکتوب نمبر:224

(43) دفتر سوم، مکتوب نمبر:5